سوانح قاسمی

یعنی

سیرت شمس الاسلام

ہمدانی ذخیرہ کتب

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ

حصہ اول

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ
اردو بازار
لاہور

سوانح قاسمی

مطبوعہ

یعنی

سیرت شمس الاسلام

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولٰنا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ

حصہ اوّل

رئیس القلم حضرت مولٰنا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ رحمانیہ ⊙ اُردو بازار ⊙ لاہور

مطبوعہ

سوانح قاسمی جلد اول

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
1	ننگ اسلاف ــــ نانوتوی کا اقرار	ب
2	سوانح قاسمی دارالعلوم دیوبند کی ملکیت	ب
3	القابات ــــ نانوتوی	2، 4، 23، 112، 288، 480
4	نانوتوی کا اہم مورچہ دارالعلوم دیوبند تھا	3
5	نانوتوی کی آواز کو قم عیسی سے شبیہ (معاذاللہ) اشعار	5
6	حاجی امداداللہ کی زبانی نانوتوی کی بڑائی	7،65،480
7	القابات ــــ رشید احمد گنگوہی	9
8	سوانح قاسمی کے مصنف کا انتخاب ــــ الہامی واقعہ ہے	20
9	ایام طفلی کا خواب ــــ خدا کی گود میں (معاذاللہ)	25،130
10	نسب نامہ ــــ قاسم نانوتوی ــــ محمد بخش	25،113،159،160
11	نانوی جوڑ توڑ کا کھیل کھیلتے	27
12	سرکار (انگلشیہ) نے آدھی تنخواہ بھی دی	27
13	گنگوہی اور نانوتوی کی حاجی صاحب سے بیعت	28
14	لڑکپن میں خواب ــــ مر گیا قبر میں جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے	33،567
15	مستقبل کی خبر ــــ یہ شخص ایسا ہونے والا ہے ــــ سب اس کی خادمی کریں گے	33
16	مفسدوں (جنگ آزادی کے ہیرو) سے مقابلہ ــــ گولی لگی مگر اثر نہ ہوا	37
17	مخبری تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے	37
18	حاجی صاحب کو گورنمنٹ کا تلاش کرنا ــــ مگر نظر نہ آئے	37
19	دارالعلوم دیوبند کے بانی ــــ حاجی سید محمد عابد صاحب	39،199،200،485
20	امام مالک مرقد انور کو عرش عظیم سے افضل قرار دیتے ہیں	53
22	خواجہ بخش	59،66،68،71
23	سید احمد بریلوی قتیل ــــ اور سیرت احمد ابوالحسن ندوی	63
24	سید صاحب کا تصرف شیعہ پہ ــــ جوتیاں چھوڑ کر بھاگا	65

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
25	سید صاحب کی محبت کا اثر	74
26	سید احمد دہلوی کا مسجد کے باہر سے کسی بزرگ کا بھانپ لینا ـــــ غیب	75
27	فحش گوئی ـــــ رنڈیوں سے کہا تم کیوں شرماتی ہو کرنے والا کون	80
28	نماز غوثیہ ـــــ شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ ـــــ ناجائز ـــــ مگر خاموش	81
29	حاجی صاحب کے مہمانوں کا کھانا پکانا ـــــ خواب ـــــ کھانا ہم پکائیں گے	84
30	حیات انبیاء ـــــ خواب میں حاجی صاحب کا ہاتھ نور محمد کے ہاتھ میں دیا	85
31	سید صاحب کا ہاتھ خواب میں حضور علیہ السلام کے دست مبارک میں	87
32	حاجی صاحب مثل سید احمد ریلوی کے	87
31	کرامات امدادیہ تھانوی کی تالیف	88
32	مملوک العلی کا تقرر گورنمنٹ برطانیہ کے دور میں اور تنخواہ	222،210،206،102
33	سید احمد ریلوی اور اسماعیل دہلوی	110
34	گورنمنٹ کے وکیل ـــــ شیخ وجیہ الدین	123
35	نانوتوی کے والد کی شکایت ـــــ میرا ایک ہی بیٹا اُمید تھی کہ کماتا	500،498،495،126
36	انسانیت سے بالا درجہ ـــــ مقرب فرشتہ ـــــ نانوتوی	130
37	نانوتوی کی خدمت میں کبھی بلا وضو نہیں گیا	130
38	علم غیب ـــــ بڑے عالم ہوگے نہایت شہرت ہوگی	132
39	بزرگوں کے واقعات بیان کرنے میں محتاط	135
40	حدیث ـــــ اُس وقت بھی نبی تھا جب ـــــ	136
41	تاریخ پیدائش نانوتوی	146
42	دست بوسی اور قدم بوسی کو دل کو چاہتا ـــــ نزاکت دلبری کسی معشوق میں نہ دیکھی	155
43	دیو معنی شیطان	179
44	زمین کا کہنا ـــــ سلام ہو تجھ پر اے ہمارے آباد کرنے اور ـــــ	180
45	نانوتوی کا کہنا میں نے کبھی تازہ باسی روٹی مٹھائی ـــــ زبان سے نہیں مانگی	182
46	نانوتوی کو کتب بینی اور مطالعہ کا شوق نہیں تھا	342،191،190
47	سید صاحب کا علم غیب ـــــ دیوبند سے گزرے ـــــ علم کی بو آئی	202
48	1857ء کی جنگ آزادی کو بغاوت کے نام سے موسوم	218
49	نانوتوی نے دہلی میں مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی یعنی سرکاری مدرسہ میں	223،222

50	نانوتوی کا مطبع احمدی میں مزدوری کرنا	224
نمبر شمار	**عنوان**	**صفحہ**
51	گنگوہی اور نانوتوی کی پیدائش کا سن ہجری	261،228
52	گنگوہی نے قسم کھا کر کہا مجھ میں کوئی کمال نہیں	246
53	نانوتوی ـــــ قرآن کے الفاظ میں غور کرو مطلب صاف ہو جاتا ہے	247
54	نانوتوی ـــــ حدیثوں کے اسرار و رموز سمجھنے میں شروح و حواشی سے مستغنی	247
55	غدر ـــــ گنگوہی کی دہلی میں آمد	252
56	بقول گنگوہی ـــــ عبد القادر نامی مجذوب کا کشف ـــــ مستقبل کی خبر	255
57	علم غیب ـــــ عبد القادر نامی مجذوب کا نانوتوی کو کہنا ـــــ جا تو بڑا عالم ہے	256
58	علم غیب ـــــ تعویذ دیتے اور بتا دیتے لڑکا ہے یا لڑکی	256
59	راؤ کا نانوتوی کو کہنا ـــــ اپنی آنکھوں سے دو جہاں کے بادشاہ کے سامنے بخاری پڑھتے دیکھا	257
60	نبوت کی طرف پیش قدمی ـــــ تسبیح کے وقت گرانی ـــــ سو سو من کے پتھر	258
61	نبوت کی طرف پیش قدمی ـــــ نبوت کا فیضان ـــــ یہ وہ ثقل ہے جو ـــــ وحی کے وقت	346،301،259
62	غدر 1857ء ـــــ فتنہ 533،531	420،397،318،271
63	کچھ لوگوں نے گورنمنٹ کو درخواست دی نانوتوی نے جہاد کے لئے مدرسہ کھولا ہے	272
64	نانوتوی ـــــ جذب کی حالت میں	276
65	گورنمنٹ کا آدمی ـــــ نانوتوی کو گرفتار کرنے آیا اور خود مغلوب ہو گیا	277
66	نانوتوی ـــــ اکثر دیکھا ہوں رداء میں ڈھانپ لیتے ـــــ غائب ـــــ سرکاری افسر	278
67	انگریزی حکومت کے اہلکارے دیوبند کا معائنہ کرنے کا ارادہ ـــــ گنگوہی نے کہا مراقب نہ لاٹ (انگریز) آئے نہ	279
68	نانوتوی کو گھبراتے نہ دیکھا ـــــ جھوٹی سچی خبریں ـــــ کام معمول کے مطابق	282
69	گنگوہی ـــــ ہمیں کیا خبر تھی کہ حاجی صاحب ہمیں مونڈھیں گے	287
70	گنگوہی ـــــ مجھ سے ذکر و شغل، محنت و مجاہدہ نہیں ہو سکتا ـــــ رات کو نہ اٹھایا جائے	292
71	اعلیٰ حضرت حاجی صاحب	293
72	گنگوہی کو نانوتوی نے حاجی صاحب کا مرید کر دیا اور گنگوہی نے نانوتوی کو	293
73	حاجی صاحب ـــــ مجھے نانوتوی عطا ہوا ہے	294
74	جدھر دل کا میلان یعنی حاجی صاحب کی طرف وہ قبول نہیں کرتے شیخ محمد صاحب اپنی طرف کھینچتے ہیں	297

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
75	نانوتوی کو طریقت میں قابلیت شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے آن واحد میں سلوک طے	302
76	نانوتوی رات کو کواڑ اتار کر اندر جاتے ۔۔۔۔ چند ماہ اسی ھو کے مکان میں گزر گئے	305
77	نانوتوی جیسے پڑھنے میں تیز ایسے ہی کھیل میں	308
78	نانوتوی کو کم سنی میں ہی ولایت مل گئی ۔۔۔۔ کھلی کرامتیں سرزد ہوئیں	317
79	نانوتوی کا شیعوں کو بیداری میں دیدار نبوی کرانے کا اعلان	318
80	کائے کی خریدار سات روپے ۔۔۔۔ مسافر آدمی نے سات روپے دیئے ۔۔۔۔ حیران رہ گیا	320
81	تھانے دار کو کہہ دو حجام ہمارا آدمی ہے چھوڑ دو ۔۔۔۔ ورنہ	322،321
82	ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عرش کے نیچے پہنچا دیا ۔۔۔۔ دربار الٰہی میں حاضر	326
83	یہ دیوبندی ہیں، یہ وہ ہیں، اچانک غیبی امداد ۔۔۔۔ وفات یافتہ کی امداد	330
84	بزرگوں یا ولی اللہ صاحب مزار سے امداد کا مسئلہ قبول	332
85	نانوتوی کی بڑائی ۔۔۔۔ بڑے بڑے لوگ دیکھ مگر نانوتوی کی نسبت کا کہیں پتہ نہیں	337
86	تصرف ۔۔۔۔ مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے	340،339
87	نانوتوی تصرف ۔۔۔۔ میرٹھ سے توجہ ۔۔۔۔ ورنہ مر جاتے ۔۔۔۔ حاضر و ناظر	344
88	تھانوی ۔۔۔۔ اکابر دیوبند کی کتابیں عربی میں کر دیا جائے اور نام نہ لکھا جائے تو لوگ رازی و غزالی کے زمانے کی بتلائیں گے	348
89	حرام کھانے کا احساس نانوتوی جلد ہی کر لیتے ۔۔۔۔ قے کر دیتے	365
90	نانوتوی کو حاجی صاحب سے بے نظیر تعلق تھا	365
91	نانوتوی مکہ معظمہ میں ۔۔۔۔ آمد کو چھپا رکھا ۔۔۔۔ پھر	370،369
92	مولوی عبدالحق خیر آبادی ۔۔۔۔ مملوک العلی کی اقلیدس پر اعتراض کئے	383،370
93	نانوتوی کا اعلان ۔۔۔۔ اعتراض کرنے والے میدان میں آئیں ۔۔۔۔ پھر	372
94	نانوتوی کتاب سے کچھ نہ کہتے تھے ۔۔۔۔ فہم خداداد سے کہتے	377
95	مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ اور اسماعیل دہلوی ۔۔۔۔ نوک جھونک	384
96	نانوتوی ۔۔۔۔ فتویٰ نہیں دیتے تھے	390،389،388،386
97	نانوتوی ۔۔۔۔ مسئلہ کا جواب دیتے	388،386
98	نانوتوی کی زبان پر روح القدس کی تقریر	396
99	نانوتوی ۔۔۔۔ میں بے حیا ہوں اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں	399
100	نانوتوی ۔۔۔۔ وعظ ہمارا کام نہیں ۔۔۔۔ نہ ہمارا وعظ موثر	400

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
101	وعظ کام تھا اسماعیل دہلوی کا	400
102	مولوی اسماعیل دہلوی کے دل میں دوسروں کی راہ نمائی	402
103	اسماعیل دہلوی کی تقریروں سے پشاور سے چاٹگام تک زمین ہلنے لگی	403
104	نانوتوی نے کوئی خاص کتاب نہیں لکھی	408
105	نانوتوی ـــــ ہر طرح سے کورے	411
106	نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند میں نہیں پڑھایا	412
107	کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ چادر اوڑھ لے ـــ نانوتوی سونگھ کر بتا دیتے عورت نے یا مرد نے	414
108	ایک خاص جماعت بنائی ہے	422
109	غیب ـــــ صبح نماز میں بلا وضو نہیں آنا چاہیے تھا	435
110	اختیارات ـــــ حضور علیہ السلام نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو علم عطا فرمایا	436
111	فراست ایمانی سے مولانا امروہوی کے تاثر کو بھانپ لیا	440
112	نذرانہ ـــــ گھاڑے کا تھان ـــ قبول	441
113	جاؤ گنگوہی سے بیعت کرو ـــــ بیعت کے بعد آئے تو	447
114	غریب آدمی کی دعوت ـــــ دال ماش، بلانے نہ آیا ـــ خود گھر گئے	458 تا 460
115	سب لوٹے مختون ـــــ ڈرا استنجا نہیں کرنا	465
116	ارے گنوار کے لونڈے	464
117	ہنسی کیا کرتے کبھی ٹوپی اتارتے کبھی کمر بند کھول دیتے	466
118	نانوتوی کا نبو پہلوان کے کرتب دیکھنا	468
119	نانوتوی کا حقہ کی چلم بھرنا	468
120	حافظ جی نانوتوی کو سہلاتے اور کمر ملتے	470
121	میلاد کے متعلق مناظروں کا سلسلہ ـــــ براہین قاطعہ ـــ مولوی عبدالسمیع	171
122	رنڈی اپنی سیانی بیمار چھوکری نانوتوی کے پاس تعویذ کے لئے لائی ـــ اس کی کمائی پر بسر اوقات تھی اس رنڈی کی	175
123	مولود شریف کے متعلق رائے	176
124	گنگوہی نے افیون کھانے کی ایک شخص کو تھوڑی سی اجازت دی	477
125	جہدو جہد آزادی میں نانوتوی شریک (جھوٹ) ـــــ حکومت نے مجرم قرار دیا	531
126	حکومت نے نانوتوی پر سے پابندی اٹھالی	532

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
124	بھنگیوں کو کھانا کھلانا	570
128	نانوتوی سفر میں ہدیہ نہ لیتے تھے	580
129	کن لوگوں کا ہدیہ لینے کو جی چاہتا ہے	580
130	مدرسہ دیوبند پر بغاوت پھیلانے کا الزام۔۔۔نبی علیہ السلام سے طے کر لیا یہ مدرسہ ہمیشہ رہے گا۔۔۔خبروں کی پروانہ کرو	583
131	نانوتوی کی مرض وفات میں ککڑی کی خواہش	591
132	حدیث۔۔۔مفہوم۔۔۔اللہ تعالی حضور ﷺ کی رضا چاہتا ہے	593
133	نانوتوی کے حالات کو حضور علیہ السلام سے تشبیہ (معاذاللہ)	604
134	حاجی صاحب۔۔۔معمولی بیماری میں ہائے ہائے اتنا کرتے مکان سر پر اٹھا لیتے	610

تقریب

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

بانیٔ دارالعلوم شمس الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح حیات کی ترتیب ہر ایک فرزندِ دارالعلوم کے دل میں مدتوں سے موجزن تھی، اور ہر بہی خواہِ دارالعلوم خواہشمند تھا کہ بانیٔ دارالعلوم کی سوانح حیات بھی دارالعلوم کی طرح نور افزائے دیدہ و دل ہو لیکن کل امر مرہون بوقتہ کے اصول پر حضرت صاحبِ سوانح کی وفات کے پورے چھہتر برس بعد تیاریٔ سوانح کی یہ سعادت حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی ممدوح نے اپنے دل کی لگی سے یہ اہم کام حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی دام فیضہ کے سپرد کیا مولانائے ممدوح نے بطیب خاطر قبول فرماکر دو تین سال کی مدت میں کافی محنت و عرق ریزی سے اسے اختتام تک پہنچایا۔ اور آج ہم اس قابل ہیں کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے کمالات و سوانح زندگی کا یہ مقدس ذخیرہ انتہائی مسرت و ابتہاج کے ساتھ ملک اور قوم کے سامنے پیش کر دیں۔ ابتداءً یہ سوانح ذاتی طور پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے مولانائے ممدوح سے لکھوائی۔ لیکن میری گذارش پر اس سے اپنا حق اٹھا کر اسے شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند کے حوالہ فرما دیا اور آج ۲۵ رجب ۱۳۷۳ھ کی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے اپنے متفقہ ریزولیوشن کی رو سے یہ کتاب ادارۂ نشر و اشاعت سے لیکر براہ راست دارالعلوم دیوبند کی ملکیت قرار دیدی ہے، اور اس سوانح کو اس کا واجبی حقدار قرار دیا ہے کہ اسے براہ راست دارالعلوم طبع اور شائع کرائے اور دارالعلوم ہی اس کا اور اس کے منافع کا حقدار ہو، جیسا کہ اس سوانح کی عظمت و شان کا اقتضا تھا۔ مجلس کے ریزولیوشن کے الفاظ یہ ہیں۔

"حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی سوانحعمری جو حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے تالیف فرمائی ہے اس کی مستحق ہے بلکہ اس کا حق ہے کہ اسے دارالعلوم دیوبند کی جانب سے طبع کرا کر شائع کیا جائے ...... اس کتاب کے جمیع منافع دارالعلوم کی ملکیت ہوں گے۔"

اندازہ کیجئے کہ صاحب سوانح تو حضرت نانوتوی رحؒ ہوں اور سوانح نگار حضرت مولانا مناظر احسن صاحب ایسا اہل قلم اہل دماغ اور اہل دل بزرگ ہو اور اس کا سب سے بڑا طلبگار اور کفیل دارالعلوم دیوبند ہو تو کتاب کی عظمت و افادیت کس درجہ کی ہوگی۔

ننگ اسلاف **حسین احمد غفرلہٗ**

۲۵ رجب ۱۳۷۳ھ

ایک ایسے علمی، اخلاقی اور ملّی نصب العین کے ساتھ رونما ہوئے جس کے جوہری اجزا ترویج کتاب و سنت، تہذیب اخلاق و کردار اور نظام استقلال ملی تھے۔ آپ کی مسیحا نفسی نے قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا۔ اُن کے لئے علم الٰہی کی روشنی کو ملک گیر ہی نہیں ہمہ گیر بنایا جس سے قوم ورطۂ حیرت سے نکلی۔ خلق و عمل کا میدان ہموار کیا، جس سے قوم کا تعطل اور جمود ختم ہوا، قومی خود ارادیت کا پرداز ڈالا جس سے بے بسی اور بےکسی اور احساس کمتری کے وساوس کافور ہوئے۔ غرض علم، اخلاق اور قدرتی تنظیم کے روشن نصب العین سے قوم کی ذہنیت میں روشنی آئی اور وہ اندھیریوں میں بھٹکنے کے بجائے روشنی کی فضاؤں میں گامزن ہونے کے لئے کمربستہ ہوگئے وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

آپ کے نصب العین کا مرکزی نقطہ تعلیمی نہضۃ تھی۔ جس سے علم الٰہی کی شعاعیں ہندو بیرون ہند پر پڑیں، پھر اس کے تحت آپ کی اخلاقی قوتوں کے تصرفات کا مرکز تربیت و ارشاد تھا جس سے وجدِ حال کے نقشے طالبوں کے دلوں میں جمے۔ آپ کے جوشِ عمل کا نقطہ اعلاء کلمۃ اللہ تھا جس سے جوش جاں سپاری مجاہدوں میں پیدا ہوا۔ آپ کی دینی مدافعت بیضۂ اسلام کی حفاظت اور تمام غیر اسلامی حملوں سے مذہبی سرحدات کی نگہداشت تھی۔ جس سے دین کو قرار ہوا۔ آپ کی اندرونی طور پر عقلی آزادی اور فکری بے قیدی کے حملوں کی علمی مدافعت کا نقشہ آپ کی وہ فلسفیانہ تصانیف تھیں، جنہوں نے وقت کے فلسفہ پسند اور منطق نواز حلقوں میں ہلچل پیدا کردی۔ قوم کے عملی نقائص اور معاشرتی کمزوریاں رفع کرنے کے لئے آپ کے اصلاحی اقدامات کا خاکہ علمی مواعظ اور عملی تنظیم تھی۔ جس سے بگڑی ہوئی معاشرت درست ہوئی پھر دفاع و تعمیر کے اس مرکب نصب العین کو بروئے کار لانے اور منظم طریق پر چلانے کے لئے آپ نے جو اہم ترین مرکزی مورچہ تیار کیا وہ دارالعلوم دیوبند تھا جس میں آپ کے نصب العین کے تمام بنیادی نقوش مرتسم تھے جو ایک ایک کرکے ابھرے۔ اس یادگار زمانہ مرکز کے راستہ سے آپ نے ایک ایسا حکیمانہ نظام یادگار چھوڑا۔ جس سے بیک وقت عالم و درویش، مجاہد و صالح و مصلح افراد ڈھل ڈھل کر نکلتے رہیں اور کام چند شخصیتوں تک محدود

نہ رہ جائے۔ آپ کی اس مرکزی دعوت اور بنیادی رعایت نے نہ صرف نگاہوں اور دلوں کے رخ ہی آپ کی طرف پھیر دیئے بلکہ وقت کے نازک حالات کی ان چارہ سازیوں نے جو آپ کے وجود باجود سے نمایاں ہوئیں، عرب و عجم کی توجہات کو آپ کی ذات میں مرکوز بنا دیا اور آپ ایک ایسے محبوب القلوب اور مرجع خلائق زعیم و رہنما کی صورت سے قوم میں نمودار ہوئے کہ لوگ جوق جوق آپ کے پیش کردہ نصب العین کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ اس حقیقت کو حضرت والا کے جانشین خاص و تلمیذ ارشد مجاہد بے بدل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ نے اپنے جلیل القدر استاد کے مرثیہ میں بسلسلۂ ذکر بناء دار العلوم چند اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ جن کا اضافہ اس مقدمہ کے لئے نور اور ناظرین کے لئے سرمایۂ سرور ہوگا۔ فرمایا

اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں کہ اک مردِ خدا[1] — آرہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ علَم
بے نیازی و توکل رُخِ روشن سے نمود — قطعِ منزل کے لئے دونوں قدم تیغِ دودم
چہرۂ خوب سے انوارِ تواضع ظاہر — نظرِ نیک سے آثارِ غنا مُستفہم
کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کے فی الفور — پڑگئی جان میں جان آہی گیا دم میں دم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور — زینۂ بام ترقی پہ بڑھا سب کا قدم
تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج — تھے عجائب ہی کچھ اس شیرِ خدا کے دم خم
گاڑ کر اس نے علَم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہلِ مَدَر اہلِ خِیَم
اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی — کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم
عقل و انصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر — ذوقِ علمی کا تھا جس سینہ میں تھوڑا سا بھی دم
دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے فروغ — خیر کا شمّہ بھی تھا جس کے مقدر میں رقم
باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے نحن معک — چل پڑے جو بھی ملا اس یمِ رحمت کا قدم
اس مربی دل و جان کی مسیحائی سے — علم دیں کا زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عدم

[1] مراد حضرت نانوتوی قدس سرہٗ

ظلمتِ جہل وضلالت میں پڑے سوتے تھے
نورِ علمی سے ہوا اس کے جہاں صبح دودم

ابرِ علم و عمل و فضل کا بادل برسا
جس جگہ اس یم رحمت کا پڑا نقش قدم

جہل کو جب سبھی کہنے لگے اِخسأ اِخسأ
چلدیا پاؤں دبے چپکے سے با بخت دژم

علم کو لاکے ثریا سے ثریٰ پر رکھا
آنکھوں سے دیکھ لیا علّم مالم یعلم

دولت علم سے سیراب کیا عالم کو
قاسم علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا عَلَم

اس کی آواز تھی بیشک تم عیسیٰ کی صدا
جس کے صدقے میں لیا علم نے دوبارہ جنم

طائرِ علم شریعت کے لئے یہ دو بَین
برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم

سلسلے علم کے امصار و قریٰ تک جاری
اس کی ہمت سے ہوئے بل یہ ترا فیضِ اعم

جملہ اعیان و اکابر تھے جلو میں اس کے
اسکی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم

دار العلوم دیوبند ہی کے اس ہمہ گیر تعلیمی نظام نے جو مدارس کی صورت میں ہندوستان بھر میں پھیلا، دہریت و الحاد کے اس سیلاب پر بند لگایا جس کا دھارا مغرب کی جانب سے بہتا ہوا دیارِ ہند کے گھروں میں داخل ہوا اور چاہتا تھا کہ خشک و تر کو بہا لیجائے۔ اگر لارڈ میکالے نے یہ کہہ کر اپنا نظام تعلیم ہندوستان میں پھیلایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں، اور روح و فکر کے لحاظ سے انگریز۔ تو اس جلیل القدر شخصیت نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالتے ہوئے لسان حال سے یہ عملی صدا بلند کی کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندی و سندھی ایرانی و افغانی خراسانی و ترکستانی ہوں۔ لیکن روح و فکر کے لحاظ سے عربیت و اسلامیت کی روح سے معمور اور بھرپور ہوں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانان ہند کی قومیت کی تخریب کے لئے جو سیلاب تعلیمی رنگ سے میکالے کے روپ میں اٹھا، اور ان کی مذہبی تخریب کے لئے جو دھارا پادریوں کی منظم تبلیغ یا آریوں کے منظم پرچار کی صورت میں بہا اس پر بند لگانے کا کام صرف اس تعلیمی تحریک نے کیا جو حضرت نانوتوی قدس سرہ کے روپ میں نمودار ہوئی، اور

شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی شہادت ہے کہ

"ایسے لوگ صدیوں پہلے پیدا ہوا کرتے رہتے تھے کئی صدی بعد اللہ نے ایسی

شخصیت پیدا فرمائی ہے۔"

اور ضیاء القلوب میں ارشاد فرمایا کہ

"قصہ برعکس ہوگیا میں ان کی جگہ ہوتا (یعنی مرید بنتا) اور وہ میری جگہ ہوتے (یعنی

میرے پیر بنتے)۔"

وہیں یہ تلخ حقیقت بھی انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ان کی سبق آموز زندگی اور سوانح حیات سے

اب تک ہم محروم رہے۔

اس سے انکار نہیں (اور انکار کرنا کفران نعمت بھی ہوگا) کہ قاسمی علوم و اخلاق اور عزائم و اذکار کا ذوق فی الجملہ قدیم اساتذۂ دارالعلوم اور مشائخ دیوبند کی مجلسوں تقریروں اور حلقہ ہائے درس کی بدولت مستفیدین کی ذہنیت میں پیوست ہوتا رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ غیر شعوری فیضان کا تھا جو شخصیات کے ذریعہ زبان بزبان اور عمل اور بعمل منتقل ہوتا رہا، کبھی بانتساب اور کبھی بلا انتساب۔ کوئی اصولی اور علمی یا باضابطہ افادہ کا انداز نہ تھا جس کا مقصد خالص اسی زندگی کا پہنچانا ہوتا۔ اور چونکہ اس کا مدار شخصیتوں کے قول و عمل یا اتفاقی بیان و تحدیث سے رہا۔ اسلئے نتیجہ یہ ہوا کہ شخصیات کے اٹھتے رہنے سے وہ فیضان بھی کم اور گم ہوتا رہا اور اس کے باضابطہ منضبط نہ ہونے سے سوائے اہل درس اور مجلس نشین یا صحبت یافتہ افراد کے عام علمی حلقے تک بھی اس سے مستفید نہ ہو سکے۔ بلکہ خواص کی حد تک بھی اگر یہ کہہ دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا کہ قاسمی زندگی کا فیض تو کسی حد تک ہی پہنچا، لیکن زندگی سامنے نہ آئی۔

بہر حال اس قاسمی زندگی کا جامع اسوہ بھی عام نہ ہو سکا اور خاص طبقہ میں کسی حد تک غیر شعوری انداز سے آیا بھی تو وسائل فیضان کے اُٹھ جانے سے اس میں بھی کمی آگئی۔ پھر کم و بیش جو کچھ بھی آیا وہ بھی دوسروں کی زندگی کے سانچوں میں ڈھل کر آیا، جسے خالص اسوۂ قاسمی بھی کہنا

اس روایتی مواد کا یہ تقاضا خدا نے پورا کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ سوانحات کے مسودات کے مسلسل تلف وضیاع کا زخم موجودہ مختصر سوانح کی درایتی تکمیل سے انشاء اللہ بھر جائے گا۔ اور اس لئے سوانح نگاری کے سلسلہ میں مولانا کی شخصیت کا انتخاب من جانب اللہ ایک الہامی واقعہ نظر آتا ہے۔

حق تعالیٰ مولانا ممدوح کو ہم سب خدام قاسمی کی طرف سے جزاء خیر عطا فرمائے اور اُن کے مراتب میں اس سے زیادہ ترقی فرمائے جتنی کہ اس سوانح سے مستفید ہونے والوں کو قاسمی نقش قدم پر چل کر ملنے والی ہے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

سوانح کا مسودہ موصول ہونے پر ضرورت سمجھی گئی کہ ایک بار اس کی خواندگی کر لی جائے تاکہ کتابت وغیرہ کے سلسلہ میں کوئی فروگذاشت ہوگئی ہو تو اسے درست کر دیا جائے۔ چونکہ کتاب اہم تھی اس لئے بجائے کسی ایک شخص کو یہ کام سپرد کرنے کے ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ جس کے تین ارکان تجویز ہوئے حضرت الاستاذ العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاذ دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر شعبہ کتابت دارالعلوم دیوبند احقر راقم الحروف محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ہم تینوں نے روزانہ مقررہ وقت پر جمع ہوکر مسودہ کی خواندگی کی اور باجازت حضرت مؤلف دام مجدہٗ نظر ثانی کے طور پر کی۔ اثناء خواندگی میں

(۱) اگر عبارت میں کوئی حرف یا کلمہ کتابت میں آنارہ گیا تھا تو اسے سیاق سباق کی مدد سے بڑھا دیا ہے اور مکرر آگیا تو حذف کر دیا گیا ہے۔

(۲) روایت واقعہ میں اگر رواۃ کی طرف سے کہیں تسامح پایا گیا یا کسی روایت کا دوسری روایت سے تعارض محسوس ہوا تو اس کا مناسب تدارک اور رفع تعارض کر دیا گیا۔

(۳) کسی مختصر واقعہ کی تفصیل ضروری سمجھی گئی تو اسے حاشیہ میں لے لیا گیا ہے۔

(۴) کہیں کہیں توثیق روایت کے لئے کوئی تائیدی واقعہ جو دوران خواندگی میں ذہنوں میں آیا

شرح ہے۔ نہایت ہی نامناسب اور ناقدر شناسی ہوتی اگر اس تفصیلی سوانح کو اسکے حق میں حجاب بنا کر اسے ہمیشہ کے لئے چھپا دیا جاتا۔ اس لئے ابتداء کتاب میں اس تفصیلی سوانح کے متن کے طور پر یہ مختصر سوانح بھی بجنسہ لے لی گئی ہے تاکہ اجمال و تفصیل دونوں سے بیک وقت فائدہ اٹھایا جائے۔ اور تفصیلی سوانح میں جہاں بھی اس مختصر کا کہیں حوالہ آیا ہے وہاں اس کے صفحات کا عدد بھی نقل کر دیا گیا ہے تاکہ اصل عبارت کتاب کی طرف رجوع کرنا آسان ہو جائے۔

افادۂ مزید کے لئے حضرت والا کی مخصوص نامزد اشیاء کے چند فوٹو بھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے جابجا شامل کتاب کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ سیرت کے ساتھ بعض چیزیں اپنی صورت کے ساتھ بھی سامنے آجائیں۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس خدمت کو قبول فرمائے اور لوگوں کو اس کے علمی و عملی پہلوؤں سے نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت صاحب سوانح کی مقبولیت کے طفیل میں ہم سب کو حسن خاتمہ کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً والیہ یصعد الکلم الطیّب والعمل الصالح یرفعہٗ۔

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ

علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے۔تمام عمر کھیتی کی اور ویسے ہی عادات اور ڈھنگ موٹے
قصبات کے سے تھے مگر نہایت ہی صاحب مروت و اخلاق کنبہ پرور، مہمان نواز نمازی پرہیزگار
تھے۔ان کے والد شیخ غلام شاہ تھے۔احقر نے ان کی بھی زیارت کی تھی تھوڑے پڑھے ہوئے
تھے مگر ذاکر شاغل تھے درویشوں کی خدمت کرتے۔تعبیر خواب میں مشہور تھے جناب مولوی
صاحب نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں ان
کے والد نے یہ تعبیر فرمائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہو گے، اور
نہایت شہرت ہوگی یہ تعبیر ان کی درست ہوئی، اور میری بہن نے خواب میں دیکھا کہ ایک ترازو
چھوٹی (جیسے لڑکے کھیلا کرتے ہیں) آسمان سے گری ہے اور اس پر ابابیل جانور سیاہ رنگ
کے بہت لپٹے ہوئے ہیں اگر چھڑاتے ہیں تو چھوٹتے نہیں۔سن کر یوں فرمایا کہ قحط ہوگا چنانچہ
وہ قحط جس میں باندیاں بک گئیں واقع ہوا غالباً پانچا کال اس کو کہتے تھے میرا نسب اور مولانا
کا شیخ غلام شاہ کے پردادا میں ملتا ہے اس طرح محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش
ابن علاؤ الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن مولوی محمد ہاشم اور محمد یعقوب بن مملوک العلی
ابن احمد علی بن غلام شرف بن عبد اللہ بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن مولوی محمد ہاشم
اور میاں شیخ محمد بخش کے بھائی شیخ خواجہ بخش میرے والد اور شیخ کرامت حسین دیوبندی کے نانا
ہوتے تھے جوانی میں دکن گئے وہاں نکاح کیا تھا وہاں ایک بیٹا محمد ہاشم نام تھا یہاں اولاد
پسری تھی۔اس سبب سے میرے والد کے نانا ان کے چچا ہوتے ہیں اور انواع رشتے جیسے
برادری میں ہوا کرتے ہیں باہم مرتبط ہیں، مولوی صاحب کے نانا مولوی وجیہ الدین صاحب
نانوتوی فارسی بہت عمدہ جانتے تھے اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے
بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی ہنگام آمدن حکومت انگریزی سہارنپور میں وکیل ہوئے اور نہایت عزت
و احترام اور تمول سے گذران کی نہایت طباع اور خوش فہم تھے اور چند پشت اوپر مولوی محمد ہاشم
صاحب مرحوم میں ہمارے نسب میں جا ملتے ہیں اور آگے نسب حضرت قاسم بن محمد بن

مولوی صاحب کا ایام طفلی میں ایک خواب دیکھنا
مولوی صاحب کا نسب نامہ

مولوی صاحب کا فارسی کتابوں کا پڑھنا اور عربی شروع کرنا

شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انہوں نے عربی شروع کرائی پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس رہے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری سے کچھ پڑھا۔ فارسی اور عربی کی کتابیں اول کی کچھ حاصل کیں۔ اسی[1] زمانہ میں احقر کے والد مرحوم حج کو تشریف لے گئے۔ احقر ایک برس کامل وطن رہا۔ حفظ قرآن شریف پورا ہو گیا تھا مگر صاف نہ تھا صاف کرتا تھا مولوی صاحب سہارنپور سے وطن آئے اور ان کے نانا کا انتقال (اس سال کے وبائی بخار میں) مع بہت سے لوگوں کے ہو گیا تھا اس زمانہ میں مولوی صاحب کا ساتھ رہا۔ مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو یا محنت کا سب سے اول اور غالب رہتے تھے خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل جوڑ توڑ نام ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولوی صاحب نے جب اس کا قاعدہ معلوم کر لیا پھر یاد نہیں کسی سے مات کھایا ہو بہت ہوا تو برابر رہے بلکہ ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے دروازہ مکان کا ایک دراز کوچہ تھا اور وحشت ناک جگہ تھی اور وہاں آسیب بھی مشہور تھا مگر راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ

[1] سنہ بارہ سو ستاون ہجری میں حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی نے کہ دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کا کیا ذی قعدہ میں شاید روانہ ہو گئے دہلی میں اندھیرا ہو گیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بہت بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کرتے رہے آخر جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہ قدردانی آدھی تنخواہ بھی دی۔ رجب سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں وطن سے روانہ ہوئے اور اول ذی الحجہ کو مکہ پہنچے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر برس دن میں پھر دہلی پہنچے اس وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب تھا رخصت کے دن پورے ہو چکے تھے وطن نہ آسکے ذی الحجہ میں جب چھٹی سالانہ ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی صاحب کو دہلی ساتھ لے گئے۔

دریغ نہ ہوتا تھا۔ایک بار دسترخوان پر کھچڑی کے ساتھ بہت سا گھی آیا۔ دس پندرہ آدمی تھے
جناب مولوی رشید احمد صاحب نے فرمایا کہ اتنا گھی یہ فضول ہے اس میں سے آدھا رکھ لیا
اور آدھا گھر بھیج دیا ایک بار مہمانوں کی کسی سواری کے لئے دانے کی ضرورت تھی چنے نہ ملے کہ
دانہ دَل کر دیویں گھر میں کابلی چنے رکھے ہوئے تھے وہی دَلوا کر دانہ دیدیا۔مہمان نوازی مولوی
صاحب پر ختم ہے مجھے یاد ہے کہ مولوی صاحب نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا اس کی
تعبیر یہ بھی یوں دیکھا تھا کہ میں مرگیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کر آئے تب قبر میں حضرت
جبریل تشریف لائے اور کچھ نگین سامنے رکھے اور کہا یہ اعمال تمہارے ہیں اُن میں
ایک نگین بہت خوشنما اور کلان ہے اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔
ایام طالب علمی میں مولوی صاحب نے ایک اور خواب دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر
کھڑا ہوں اور مجھ میں سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔جناب والد مرحوم سے ذکر
کیا انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا جس زمانہ میں نکاح ہوا اور
والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ نوکری کر ہی لیں گے اور بعد گذرنے
کتنی مدت کے کچھ نہ کیا تب مایوس ہو گئے اور ان کو اس امر کا بہت رنج تھا کہ اور بھائی پڑھ کر نوکر
ہو گئے کوئی پچاس کا کوئی سو کا کوئی کم کوئی زیادہ۔سب خوش و خرم ہیں اور ان کا حال ویسا ہی
اور آمدنی آراضی کی مکتفی خرچ کو نہ ہوتی تھی جناب حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ سے شکایت
کی کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا تھا اور مجھے کیا کچھ امیدیں تھیں کچھ کماتا تو ہمارا یہ افلاس دور ہو جاتا
تم نے اسے خدا جانے کیا کر دیا کہ یہ نہ کچھ کماتا ہے نہ نوکری کرتا ہے۔حضرت اس وقت تو
ہنسکر چپ ہو رہے پھر کہلا بھیجا کہ یہ شخص ایسا ہونے والا ہے کہ وہ سو پچاس والے سب
اس کی خادمی کریں گے اور ایسی شہرت ہوگی کہ اسی کا نام ہر طرف پکارا جائے گا اور تم تنگی
کی شکایت کرتے ہو خدا تعالیٰ بے نوکری ہی اتنا کچھ دے گا کہ ان نوکروں سے بڑھتا رہے گا
جناب بھائی اسد علی صاحب کی ہی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور مولوی صاحب سے

پہنچا جانتے تھے اور یہ بات اتفاقی نہ تھی اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع
پر سادہ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ تھی نہ ہوئی تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط
مستقیم ہو جاتے ہیں حاصل یہ کہ اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے، ہم
نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہ دیکھا خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ
اڑا کرتی تھی مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے چند بار مفسدوں سے
نوبت مقابلہ کی آگئی اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں
کا مقابلہ ایک بار گولی چل رہی تھی یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا جانا گولی لگی ایک
بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا فرمایا کہ سر میں گولی لگی عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان
تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔ انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق
ماری جس کے سینچے سے ایک موچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا
اور خدا جانے گولی کہاں گئی اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سینچہ بھی بس تھا مگر حفاظت الٰہی
بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا اس زخم کی خبر اجمالی بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ
تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے۔ حالانکہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے ملک و
مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے
اس لئے حاجت روپوشی کی ہوئی حضرت حاجی صاحب بھی ایسے ہی باعث سے روپوش
ہو گئے تھے۔ ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے
کوئی تھا نہیں زینہ میں آکر فرمایا پردہ کر لو میں باہر جاتا ہوں عورتوں سے رک نہ سکا باہر چلے گئے
بعضے مرد بازار میں تھے ان کو اطلاع کی وہ اتنے میں مکان پر پہنچے دوڑ سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی
تھی انہوں نے آکر تلاشی لی ہر چند بظاہر مولوی صاحب کی تلاش نہ تھی مگر پھر خوف کی جگہ تھی
اس کے بعد سے مسجد میں رہتے اور پھر کسی نے تعرض نہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چند بار
بچایا اس زمانہ کی کیفیات عجیب غریب گذری ہیں لکھنا ان کا طول ہے۔ اسی وقت میں دیوبند

اٹھا دیا تھا۔ چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا۔ پھر گھر پر اپنے رہے غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم برہم ہو گیا تھا مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا تھا اس زمانہ میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی کبھی وطن کبھی دیوبند رہتے تھے اسی وقت میں احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی پھر منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا مولوی صاحب کو پرانی دوستی کے سبب بلا لیا وہی تصحیح کی خدمت تھی۔ یہ کام برائے نام تھا مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا احقر اس زمانہ میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپہ خانہ میں نوکر ہو گیا۔ منشی جی حج کو گئے تھے، اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی احقر بھی اس میں شریک رہا۔ وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔ مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں۔

دیوبند کے مدرسہ کی بنیاد

مدرس کے لئے تنخواہ پندرہ روپے تجویز ہوئے اور چندہ شروع ہوا چند ہی روز گذرے کہ چندہ کو افزونی ہوئی اور مدرس بڑھائے گئے اور مکتب فارسی اور حافظ قرآن مقرر ہوئے اور کتب خانہ جمع ہوا مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہوئے۔ مدرسہ کے احوال لکھنا یہاں طول لاطائل ہے سالانہ کیفیتوں سے یہ سب امر واضح ہو جاتے ہیں ١٢٨٥ھ ہجری میں مولانا کو حج کی پھر سوجھی چند رفقا کو ساتھ لے کر حج کر آئے اور منشی ممتاز علی صاحب بھی اسی سال بقصد قیام عرب کو گئے مگر ایک سال بعد واپس آ گئے پھر مولوی صاحب دہلی گئے منشی جی کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا منشی جی کے پیچھے میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا اس زمانہ میں پڑھانا اکثر تھا سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی سے سنے نہ سمجھے اور عجائب و غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ و بن تک ہو جاتی

مولوی صاحب کی مدرسہ کی سرپرستی

اس خاندان کی رشتہ داری نانوتہ والوں سے بہت قدیم ہے، شاہجہانی عہد کے مولوی محمد ہاشم کی پانچویں پشت میں خواجہ بخش نامی ایک شیخزادے تھے، ان کی لڑکی کی شادی دیوبند کے دیوان والوں کے خاندان میں ہوئی تھی، دیوبند کے مشہور رئیس شیخ کرامت حسین (جو حضرت نانوتوی کے خسر ہوتے ہیں) کے نانا شیخ خواجہ بخش تھے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ نانوتہ کے شیخ زادے بھی حالانکہ صدیقی تھے، اور ان کی رشتہ داریاں بھی جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ صدیقیوں کے عثمانی اور فاروقی شیخ زادوں ہی کے گھرانوں تک محدود رہیں، چاہئے تو یہی تھا کہ ایسی صورت میں اپنے موروثی عقیدہ سنیت ہی پر وہ قائم رہتے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی جاگیر اور جائداد جو ان کی رفاہیت کی بنیاد تھی، ان کی دینی زندگی کے لئے خطرہ بنتی چلی گئی، تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا، مگر سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی ہاشم کی جاگیر کا تذکرہ فرماتے ہوئے اخیر میں جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

"تبدل حکومت کے سبب ان کی اولاد کے پاس نہ رہی" صفہ ۲۶

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کے بعد مغل حکومت کے حکمرانوں میں عمومی طور پر مختلف تاریخی مؤثرات کے تحت اعتقادی انقلاب جو برپا ہوا، خود بہادر شاہ، عالمگیر کے بعد ہندوستان کا جو مغل بادشاہ ہوا، تشیع کا شکار ہو چکا تھا،[لہ]

لہ میرا اشارہ شاہ عالم بہادر شاہ کی طرف ہے جسے ستر سال کی عمر میں بادشاہی کی قدیم آرزو کی تکمیل کا موقعہ ملا تھا، اس وقت وہ کافی بوڑھا ہو کر سٹھیا چکا تھا، سب سے پہلے تو اس نے اپنے "سید" ہونے کا اعلان کیا اور ایک بے سروپا قصہ پر اس کی بنیاد قائم کی گئی، پھر تمام ممالک محروسہ میں یہ شاہی گشتی جاری ہوئی کہ امام خطبہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے وصی ہونے کا برسر منبر اعلان و اقرار کرے، احمد آباد میں سخت خونیں فساد برپا ہوا، لاہور میں بھی ہنگامے ہوئے، وہ فاضل اجل ہونے کا دھوکہ بھی اپنے متعلق رکھتا تھا، لاہور کے علماء جن میں مولانا یار محمد سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے ان کو بلا کر اس نے براہ راست خود مناظرہ کیا، مولانا یار محمد جب اس کی باتوں کا کھرے الفاظ میں جواب دینے لگے تو بولا کہ تم میری بادشاہی کی قوت سے نہیں ڈرتے تو مولانا نے فرمایا کہ جس سے تم ڈراتے ہو؟ اسی کو تم سے میں مانگنے آیا ہوں، مجھے شہادت کی آرزو ہے، کاش میری اس آرزو کو تم پوری کر دو ۱۲

بے گر گفتگوئے مذہبی نیز بر زبان می آمد (فیوض قاسمیہ ص ۵)	جن میں کبھی کبھی مذہبی گفتگو بھی چھڑ جاتی ہے

بلکہ شیخ تفضل حسین کے شیعہ ہو جانے کے قصے کو بیان کرتے ہوئے سوانح قدیم کی مصنف امام نے جو یہ خبر دی ہے کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد اور شیخ تفضل حسین کے درمیان جھگڑا ہو گیا، اور یہ جھگڑا بالآخر اس حد تک ترقی کر کے پہنچا کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم رح) کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے (شیخ تفضل حسین) زخمی ہو کر مر گئے"۔ ص ۲۶

اگر اس فساد کا تعلق تشیع و تسنن ہی کے قصے سے تھا، اور بظاہر یہی بات معلوم بھی ہوتی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ زبان سے آگے بڑھ کر ہاتھ اور ہتھیار تک بھی ترقی کر کے کبھی کبھی نانوتہ کے شیعوں اور سنیوں کی یہ آویزش پہنچ جاتی تھی۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ "خانہ جنگی" کا یہی "شر" شاید اس "خیر" کا مقدمہ تھا، جس سے نانوتہ ہی نہیں بلکہ "اسلامی ہند" کی عام آبادیاں آئندہ زمانہ میں مستفید ہونیوالی تھیں۔

تیرہویں صدی کے مجدد کا ظہور اور نانوتہ میں انکی تشریف فرمائی

میرا اشارہ "اسلامی ہند" کے اس دینی تلاطم، اور روحانی انقلاب کی لاہوتی نعمت کی طرف ہے، جو مادی حکومت سے محروم ہو جانے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی، یہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود باجود تھا، حضرت شہید کی قدر و قیمت خصوصاً اس زمانہ میں آپ کی سیاسی جد و جہد سے وابستہ سمجھی جاتی ہے، جو سرحد کی پہاڑیوں میں تطہیر پنجاب کے لئے کی گئی، جیسا کہ معلوم ہے تطہیر پنجاب کا مقصد بحمد اللہ پورا ہوا، اسی لئے ان کی اس سیاسی جد و جہد کو بھی ناکام قرار دینے والے کم از کم میرے نزدیک سید شہید کے نصب العین کے سمجھنے میں ناکام ہوئے ہیں، بہر حال جہاں سید شہید کے تجدیدی کارناموں میں "تطہیر پنجاب" بھی اس میں شک نہیں کہ بڑا تابناک کارنامہ ہے وہیں ان سیاسی کاروبار بلکہ صحیح معنوں میں مجاہدانہ فرائض کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب

کی تجدید کا تعلق ایک طرف تو خود اسلام سے تھا، جو طول امد اور مسلمانوں کی قساوت قلب کی وجہ سے پہچانا نہیں جا رہا تھا، اور دوسری طرف مسلمانوں کے ان قلوب کو آپ نے نشانہ بنایا تھا، جن کا ایمانی احساس اسی قساوت قلبی کی بیماری کی وجہ سے غباوت کا شکار ہو چکا تھا، گویا ایک طرف تو اپنی تجدیدی شست وشو سے سید شہید "الدین الخالص" اور "ان الدین عنداللہ الاسلام" کی واقعی حقیقت کو نمایاں فرمانا چاہتے تھے، اور دوسری طرف آپ کی کوشش یہ تھی کہ ممکنہ حد تک مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے جائیں جن میں اسی "الدین الخالص" کی شناخت و یافت کا صحیح سلیقہ ہو، چنانچہ آپ اور آپ کے باوقار و زرا رکار کی جدوجہد نے ایمانی زندگی کی نئی رو دوڑا کر مختلف آبادیوں میں اسی قسم کے صالح افراد کی کافی تعداد پیدا کر دی،

اسی لئے کسی گوشہ میں بیٹھ کر سید شہید نے کام نہیں کیا، بلکہ "منصب تجدید" کی ذمہ داریاں جس دن سے ان کے اندر پیدا ہوئیں، اسی دن سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور جن بزرگوں کی ذات سے ان کی پشت مبارک مضبوط کی گئی تھی، ان کو لے کر ملک کے اطراف وجوانب میں گھومنے لگے اسی سلسلہ میں آپ علاقہ دلّی کے اس شمالی مغربی حصہ میں بھی داخل ہوئے، بڑے بڑے شہروں کے سوا ایسے قصبات مثلاً گنگوہ، دیوبند، انبہٹہ وغیرہ میں پہنچ کر اسلام کی تطہیر اور مسلمانوں کے تزکیہ میں سب مشغول نظر آتے ہیں تفصیل کے لئے حضرت والا کی مستقل سوانح عمریوں کو پڑھنا چاہیے خصوصاً آپ ہی کے دودمان عالی کے چشم و چراغ الشاب الصالح السعید المتقی والنقی مولانا ابوالحسن سید علی سلمہ اللہ تعالیٰ وایدہ اللہ بروح منہ کی "سیرت سید احمد شہید" آپ کے سامنے دین کی اس نعمت کبریٰ کی حقیقت واضح کرے گی، جو دنیا کی سلطنت کو کھونے کے بعد ہند کے مسلمانوں کو میسر آئی، جہاں تک میرا خیال ہے مسلمان فکر معقول سے اگر کام لیں گے تو شاید وہ یہ پائیں گے کہ مبادلہ کے اس معاملہ میں انشاء اللہ وہ خسارے میں نہیں رہے ہیں ع ان کان فی القلب ایمان و اسلام

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت سید شہید اپنے اس تجدیدی دورے اور گشت کے سلسلہ میں کھجوروں کے بن والے اس قصبے میں بھی تشریف فرما ہوئے، جو اپنے ہم چشم قصبوں میں

چھوٹا اور اس وقت تک چھوٹا شہر سمجھا جاتا تھا'

اس دور افتادہ مقام میں سید صاحب کے قدم رنجہ فرمانے کا ظاہری سبب جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالباً وہی "تسنن و تشیع" کی آویزش کا "شر" تھا جس سے "یہ خیر" پیدا ہوئی۔ تفصیلات کا تو علم نہ ہو سکا، لیکن سیدنا الامام الربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے تذکرۃ الرشید میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

"ہنگام قیام نانوتہ میں مسمی غلام حسین شیعوں کا مولوی تھا' وہ بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ ایک مکان میں بیٹھے تھے' جب وہ اندر آیا تو آپ متوجہ نہ ہوئے' اس پر جوں ہی اثر پڑا' تو وہ بد نصیب جوتیاں بھی وہیں چھوڑ کر بھاگا' کہ یہ شخص سید بڑا جادوگر ہے' اور جب تک سید صاحب نانوتہ میں مقیم رہے وہ جنگل میں رہا کیا' شہر میں نہ آیا۔" مبہ ۲۷۳/۲

اسی طبقہ کے ایک بزرگ سے ملنے کے لئے شیعوں کے کسی عامی آدمی کا نہیں، بلکہ ان کے مولوی کا آنا یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے' شیعہ و سنی تعلقات سے جو واقف ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ بجز خاص حالات کے یہ صورت بہت کم پیش آتی ہے' اور خواہ سید صاحب نے ظاہری طور پر بے توجہی سے کام لیا ہو، مگر غلام حسین کا متاثر ہونا' اور اس حد تک متاثر ہونا کہ بے اختیار ہو کر بھاگنا یہ واقعہ خود بتا رہا ہے کہ سید شہید نے غلام حسین پر باطنی توجہ ضرور ڈالی تھی'

بہر حال یہی واقعہ جو ایک ثقہ و حجت امام سے مروی ہے یہ بتا رہا ہے کہ نانوتہ کی سرفرازی میں اس قصبے کے مسلمانوں کا وہ رجحان بھی ضرور دخیل تھا' جو تشیع کی طرف ان میں پیدا ہو گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آویزش میں تسنن پر جن لوگوں کا اصرار تھا' ان ہی لوگوں کی دعوت پر سید صاحب غالباً نانوتہ تشریف لائے' اس کا پتہ تو نہ چلا کہ نانوتہ کے رافضیوں میں بھی کسی کو توبہ نصیب ہوئی' یا "غلام حسین" نے "ساحر" کا جو شرارہ چھوڑا' اسی شرارے میں خود بھی جلا اور دوسروں کو بھی جلاتا رہا، مگر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ دوسری روایت

تذکرۃ الرشید میں جو نقل کی گئی ہے یعنی مولانا نے فرمایا کہ

"سید صاحب جب نانوتہ تشریف لے گئے تھے، وہاں بھی بہت سے لوگ مرید ہوئے، ایک مرید نے بیان کیا کہ "میری آنکھوں میں پھر رہا ہے کہ سید صاحب مسجد جامع کے وسطی دروازے میں کھڑے ہیں، نہایت شکیل و جمیل تھے اور آپ نے اپنی پگڑی اتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لیکر باقی بیعت کرنے والوں کو پکڑوا دی، لوگ برابر دوسرے سرے تک اسکو پکڑے ہوئے تھے، اور پگڑی کن کھجورے کی شکل معلوم ہوتی تھی، کیونکہ دونوں طرف سے اسکو تھامے ہوئے تھے" ص۲۷۲

اس روایت کی بنیاد پر یہ سمجھا جا سکتا ہے، کہ نانوتہ کے مسلمانوں کی عمومیت سید شہید سے کافی طور پر متاثر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جو شیعہ تو نہیں ہوئے تھے، لیکن بقول امیر شاہ خاں اس اطراف کے عام قصبوں میں تشیع کا مقدمہ یعنی تفضیل کی بیماری پھیلی ہوئی تھی، اس بیماری سے جیسے دوسرے قصبات کو صحت نصیب ہوئی، نانوتہ نے بھی اس خوش نصیبی میں اپنا حصہ ضرور پایا ہوگا، اور ایک اسی بیماری کا نام کیوں لیجئے، سید شہید کی تجدید کا رخ جن دو اصولی باتوں کی طرف تھا، یعنی غیر اسلامی آلودگیوں سے اسلام کی تطہیر اور اسی کے ساتھ خود مسلمانوں کے نفس کا ایسا تزکیہ کہ حقیقی اسلام کے پہچاننے میں ان کو دشواری پیش نہ آئے، ان دونوں نعمتوں سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستفید نہ ہوئے، جنھوں نے سید صاحب کے عمامہ پر بیعت کی تھی۔

بلکہ سوانح قدیم میں ایک اطلاع جو یہ دی گئی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے جد امجد کے والد کے ایک سگے بھائی جن کا نام شیخ خواجہ بخش تھا، وہی

"جوانی میں دکن گئے وہاں نکاح کیا، وہاں ایک بیٹا محمد ہاشم نام تھا" ص۲۵

اس سے نانوتہ اور دکن کے ایک قدیم تعلق کا جہاں پتہ چلتا ہے، وہیں اگر یہ سوچا جائے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت دامن ہمالہ کی ایک آبادی سے دکن کی سطح مرتفع کی طرف سفر یوں ہی آسان نہ تھا، پھر اسی کے ساتھ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ "مرہٹہ گردی" کے

ہر قسم کے منافع کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا، اسے حسن ظن خیال کیجئے یا جو کچھ بھی سمجھئے میرا خیال یہی ہے کہ شیخ خواجہ بخش اور ان کے خاندان کا تعلق غالباً اسی ثانی الذکر گروہ سے تھا، شیخ خواجہ بخش تو وطن کو خیر باد کہنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کے بھائی جن کا نام شیخ محمد بخش تھا، یہی شیخ محمد بخش مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد کے والد مرحوم تھے، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولوی محمد ہاشم کی اولاد کے جن خاندانوں کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"تبدل حکومات کے سبب دیہات جو جاگیر میں تھے ان کے پاس نہ رہے"

ان ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ "محمد بخش" صاحب کا خاندان بھی تھا، جس کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔

اس وقت مذکورہ بالا معلومات کے پیش کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ نانوتہ کا دینی ماحول زمانہ کے انتشار کے مطابق اس وقت جو کچھ ہو کر رہ گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ لوگوں کو ہو جائے۔

اگرچہ تفصیلاً ان لوگوں کا تو مجھے علم نہ ہو سکا، جن کی انگلیاں کن کھجوروں کی طرح حضرت سید شہید کے عمامے کے ساتھ نانوتہ کی جامع مسجد میں لپٹی نظر آتی تھیں، لیکن خوش قسمتی سے سوانح قدیم کے مصنف امام کے بیان سے پھر بھی چند باتوں کا پتہ چلتا ہے، مثلاً

(۱) اسی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی شیخ محمد بخش جن کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں رکھنے والوں نے ان کا یہ نام رکھا تھا، اس وقت مسلمان اس کی تمیز بھی کھو بیٹھے تھے کہ اولاد بخشی کی قوت خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات واحد کے ساتھ وابستہ ہے یا نہیں، اس کا نتیجہ تھا کہ باوجود مؤمن ومسلم ہونے کے اس معاملہ میں لاپروائیوں سے کام لینے لگے تھے، خود ان ہی شیخ محمد بخش صاحب کے بھائی جو نانوتہ سے ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے آپ سن چکے کہ ان کا نام بھی خواجہ بخش تھا۔ اور تو اور امام ربانی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو والد کے ظل عاطفت سے ایام طفلی ہی میں محروم ہو گئے تھے، اسی لئے دادا کی آغوش شفقت میں آپ کی تربیت و پرورش ہوئی، مگر کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت گنگوہی کے پالنے پوسنے والے ان کے جد بزرگوار تک

کا نام "پیربخش" تھا۔[لے]

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نانوتہ کے ان ہی شیخ محمد بخش کے صاحب زادے جن کا اسم گرامی "غلام شاہ" تھا، ان ہی کے متعلق مصنف امام نے یہ ذاتی شہادت سوانح قدیم میں درج فرمائی ہے، یعنی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "احقر نے بھی ان کی زیارت کی تھی" اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ وہ یعنی غلام شاہ صاحب

"تھوڑے پڑھے ہوئے تھے، مگر ذاکر شاغل تھے، درویشوں کی خدمت کرتے تھے" ص ۲۵

قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن ذکر و شغل کی یہ دولت باوجود کم پڑھے لکھے ہونے کے جہاں تک میرا خیال ہے، غالباً حضرت سید شہید ہی کی بیعت کے بعد "غلام شاہ" تک منتقل ہوئی تھی، کیونکہ سنین کے ملانے سے اتنی بات تو یقینی ہے کہ غلام شاہ صاحب بھی نانوتہ میں اس وقت موجود تھے جب سید صاحب کی تشریف آوری کی سعادت سے یہ قصبہ بہرہ اندوز ہوا تھا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ درویشوں کی خدمت جس کا فطری ذوق تھا، اس کے وطن میں حضرت سید شہید جیسے کھلے ہوئے درویش جب تشریف فرما ہوئے تھے، تو ان کی خدمت سے وہ کیسے محروم رہ سکتے تھے، میرے پاس کوئی تاریخی وثیقہ تو نہیں ہے لیکن غلام شاہ صاحب کے اسی ذوق کی بنیاد پر دل میں یہ بات آتی ہے کہ سید شہید اگر ان کے یہاں بھی رہے ہوں تو یہ کچھ بعید نہیں ہے، کچھ بھی ہو میرا احساس، قرائن و قیاسات کی روشنی میں یہی ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متاثر ہونیوالوں میں نانوتہ کے یہ شیخ غلام شاہ بھی تھے، اور "ذکر و شغل سے ان کا تعلق بھی یہ سید شہید ہی کی بیعت یا کم از کم عقیدت کا رہین منت معلوم ہوتا ہے، سوانح قدیم کے

لے اسی زمانہ میں ایک مولوی سالار بخش نامی بھی تھے، اپنے نام کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے کہ "سال آر" کے معنی سال کا لانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ سال و ماہ کا لانے والا خدا ہی ہے، پس میں خدا بخش ہوں اس لطیفہ کا ذکر حکیم الامت کے ملفوظات میں کیا گیا ہے ۱۲

یہی غلام شاہ صاحب تھے، میں نے اس کا ذکر پہلے بھی کہیں کیا ہے، یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ رفض کے خلاف جوش و خروش کی اس کیفیت میں اگر سید شہید کی تاثیری صحبت و معیت کو دخیل خیال کیا جائے تو سید شہید کے حالات اور اصلاحی خصوصیات سے جو واقف ہیں جن کا ضمناً ذکر میں نے بھی تھوڑی دیر پہلے کیا ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خیال کو بے بنیاد ٹھیرانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسری بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ نانوتہ کے صدیقی شیوخ کے جد اعلیٰ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولوی محمد ہاشم مرحوم نے شاہجہاں کے عہد میں اس قصبہ کو اپنا وطن بنایا، خود وہ تو عالم و فاضل تھے، اور ان کے پوتے کا نام بھی مصنف امام نے "محمد مفتی" ارقام فرمایا ہے، واللہ اعلم بالصواب "مفتی" ان کا علَم تھا، یا افتاء کا کام کرتے تھے، اسی لئے اسی صفاتی لقب سے مشہور ہوئے، مگر اس کے بعد اس کا سراغ نہیں ملتا کہ نانوتہ کے شیوخ میں علم و فضل کا شوق آئندہ نسلوں میں باقی رہا، یا جیسے عموماً اس قسم کے خاندانوں میں زیادہ "علم پدر" کا شمار "میراث" میں نہیں کیا جاتا، بلکہ صرف مادی دولت و ثروت پر قناعت کر کے بقول مولانا حالی ان کا کل سرمایۂ ناز یہ رہ جاتا ہے کہ ع

احداد تھے ان کے مقبول داور

اسی عام مصیبت کا شکار یہ خاندان بھی ہو گیا تھا۔

بہر حال عدم العلم، اگرچہ شئی کے عدم کو مستلزم نہیں، مگر قرائن و قیاسات کا اقتضاء ہے کہ "علم پدر" کی طرف نانوتہ کے شیخ زادوں کی توجہ (بہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ) زیادہ دن تک باقی نہ رہی، اگر یہ صورت نہیں پیش آئی تو مولوی اور مفتی کی اولاد کے ناموں میں "محمد بخش" "خواجہ بخش" وغیرہ ناموں کی شرکت کی توجیہ آخر ہم کیا کر سکتے ہیں؟

مگر ٹھیک اس زمانہ کے بعد یعنی سید شہید کی رونق افروزی نانوتہ میں جب ہوئی، اسی کے بعد ہم یہ پاتے ہیں کہ "غلام شاہ" صاحب اور ان کے ہم عصروں میں متعدد حضرات ایسے نظر آتے ہیں، جن کے قلوب میں "میراث پدر" کے حصول کا جذبہ اچانک بیدار ہو جاتا ہے، خود

تعلیمی وتدریسی سلسلے سے تھا، اسی سے خیال گذرتا ہے کہ بصیرت کی یہ تمیز سید شہید ہی کی تاثیر نظری سے پیدا ہو سکتی تھی، اسلامی آبادیوں میں "دیدہ وروں" کا پیدا کرنا جیساکہ عرض کر چکا ہوں، ان کی مہم کا بڑا اہم جز تھا، وہ ان آبادیوں میں پہنچ کر صلاحیت رکھنے والوں کا تزکیہ فرماتے تھے جس کے بعد حق وباطل کی تمیز کی قوت ان میں خود بخود پیدا ہو جاتی تھی، بلکہ ان کی تجدید کا دوسرا جز یعنی غیر اسلامی آلودگیوں سے "اسلامی تعلیمات" کی تطہیر اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں بھی سید صاحب نے بہت کچھ کیا، لیکن درحقیقت شاہ ولی اللہ اور ولی اللہی اسباط علماؒ اس کام کو کر چکے تھے، اسی لئے اس سلسلے میں سید صاحب کے کام کا بجائے علم کے زیادہ تر تعلق "عمل" سے ہے، یعنی "ولی اللہی" سلسلے میں جو علمی نتائج منقح ہو چکے تھے، ان کی عام اشاعت سید صاحب کے ذریعہ ہندوستان کے طول وعرض میں ہوئی، فجزاہ اللہ عنا وعن امۃ محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزاء؛

خیر سید شہیدؒ کی رونق افروزی کے بعد میرے خیال کے مطابق نانوتہ کے باشندوں میں جس قسم کے انقلابی آثار کا مشاہدہ کیا گیا، اور جیساکہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اپنے استاد مولانا محمد یعقوبؒ (جن کا ذکر اس کتاب میں مصنف امام کے عنوان سے آپ سن رہے ہیں) ان ہی کے حوالہ سے یہ روایت بیان کیا کرتے تھے کہ

"ایک مرتبہ میں مسجد میں تھا (شاید نانوتہ اپنے وطن ہی کی مسجد میں تھے)، کہ نہایت نورانیت مسجد میں معلوم ہوئی، مجھے اس کی ٹٹول ہوئی، دیکھا کہ ایک صاحب ہیں، جن کا باطن نہایت نورانی تھا، اور ان کے تمام لطائف ذاکر تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے مجاہدہ وریاضت کی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں تو"۔۔۔۔۔۔۔

مولانا یعقوبؒ فرماتے ہیں کہ اسی کے بعد اس شخص نے کہا کہ

"البتہ میں تھوڑی دیر حضرت سید احمد صاحب کی خدمت میں بیٹھا ہوں"

(قصص الاکابر در الہادی ۱۳۵۶ھ جمادی الثانی)۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس شخص کی صحبت میں تھوڑی دیر کی شرکت ان عجیب وغریب نتائج کو پیدا کردیا کرتی تھی، جو سالہا سال کی ریاضتوں کے بعد بھی لوگوں کو میسر نہیں آتے، اگر اسی ہستی گرامی کی طرف نانوتہ کے ان انقلابی آثار ونتائج کو میں منسوب کرتا ہوں، تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے، اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند مؤثرات وعوامل کا ذکر کیا جائے جن سے نانوتہ کے مستقبل کی تاریخ متاثر ہوتی ہے،

عرض کرچکا ہوں کہ سید شہید اپنے تبلیغی دوروں کے سلسلے میں اس علاقہ کے مرکزی شہر سہارنپور بھی تشریف فرما ہوئے تھے، بیان یہ کیا جاتا ہے کہ سہارنپور میں ایک مسجد "بونبی والی" کے نام سے مشہور تھی، سید صاحب اسی مسجد کے پاس سے گذر رہے تھے کہ اچانک ٹھٹکے اور دریافت فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ جی ہاں! سید صاحب مسجد میں آکر ان صاحب سے ملے اور اسی کے بعد وہ عجیب وغریب واقعہ پیش آیا، جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

کہتے ہیں کہ بونبی والی مسجد میں جو صاحب تھے، ان کا نام شاہ عبدالرحیم ولائتی تھا، پہلے یہ پنجلاسہ (مشرقی پنجاب) کے ایک بزرگ سے جنکا نام شاہ رحم علی تھا، مرید ہوئے تھے، اور ان کے زیر تربیت رہ کر کالا آم کے پہاڑ میں بڑی بڑی سخت ریاضتیں کی تھیں، مگر اپنے اس پیر سے مجاز نہ ہوسکی تب امروہہ پہنچکر حضرت شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہوئے، اور ان کی تعلیم وتربیت سے مستفید ہو ہی رہے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا، اور خلافت کی سند ان سے بھی نہ مل سکی، سہارنپور میں آکر بونبی والی مسجد میں قیام فرمالیا تھا کہ اچانک دولت بیدار خود ان کے سرہانے آگئی، یعنی سید شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ عرض کیا گیا ان کے پاس ملنے کے لئے بونبی کی مسجد میں تشریف لائے، بیان کیا جاتا ہے کہ ملنے کے ساتھ ہی خلوت ہوگئی، پھر بڑے بڑے قصے درمیان میں پیش آئے، آخری نتیجہ یہی تھا کہ دو پیروں سے مرید ہونے اور باضابطہ تعلیم پانے کے بعد بھی

مولانا گنگوہی ؒ سے یہ روایت بھی اسی کتاب میں منقول ہے کہ اسی زمانہ میں جلال آباد (تھانہ بھون سے چند میل کے فاصلے پر ہے) اس قصبہ میں ایک شخص ضامن علی نامی تصوف کے مدعی ہو کر رنڈیوں سے کہتے تھے کہ

"بی تم شرماتی کیوں ہو، کرنے والا کون، اور کرانے والا کون

وہ تو وہی ہے" ص ۲۴۲ تذکرۃ الرشید

اسلامی ہند کے جس دور سے ہمارے اس مضمون کا تعلق ہے، یعنی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، اسی وقت ذرا دتی کے دینی حلقوں کا جائزہ لیجئے، آپ کو مولویوں اور صوفیوں کی یہ کش مکش اپنی انتہائی شکل میں نظر آئے گی، ایک طرف مولوی محبوب علی صاحب تھے جو باوجودے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، مگر نفل کی دو رکعتیں جو صوفیوں میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے، اور حضرت شاہ صاحب نفل کی اس نماز کو فعل مشائخ قرار دیتے ہیں، مگر شاہ صاحب کے سامنے مولوی محبوب علی صاحب محض اسلئے کہ نفل کی ان دو رکعتوں کا انتساب حضرت غوث پاک کی طرف کیا جاتا ہے، بھرے مجمع میں اعلان

(بقیہ صفحہ گذشتہ) سید صاحب کا شاہ فدا حسین صاحب کے ساتھ اس تعلق کا انکشاف میں خیال کرتا ہوں کہ سید صاحب کے دینی عقائد اور خیالات کے تجزیہ و تحلیل میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوگا۔ سید صاحب پر اپنے نانا خواجہ فرید الدین کا غیر معمولی اثر تھا انھوں نے "سیرت فریدیہ" کے نام سے اپنے نانا صاحب کی سوانح عمری بھی لکھی ہے، خواجہ فرید اپنے بھائی شاہ فدا حسین کے رسول شاہی فرقہ کے ایک فقیر مکا شاہ کے مرید بھی تھے اور گو چار ابرو کا صفایا جو اس طریقہ کی خصوصیت تھی، خواجہ فرید نے زندگی بھر نہیں کرایا، مگر مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "مرنے سے دو برس پہلے ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی بھی کرنی چاہئے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرا دیا" ص ۲۳ حیات جاوید۔ بہر حال عام طور پر یہ مشہور ہے کہ کلیۃً مغربی خیالات ہی سے سید صاحب متاثر تھے، اس مشہور خیال میں ممکن ہے کہ مذکورہ بالا انکشاف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترمیم کرنی پڑے کہ سید صاحب کے قلم کی ناقابل برداشت بے باکیاں جہاں تک میرا خیال ہے ان کے ان ہی غیر شعوری احساسات کے بظاہر نتائج ہیں جن کی پرورش ایام طفولیت ہی میں خود ان کے گھر میں ہوئی تھی" ۱۲

کہتے ہیں کہ

"میں تو حضرت (شاہ عبد العزیز) اس نماز کو ناجائز فرما رہے ہیں، مگر گالیوں کے ڈر سے صاف جواب نہیں دے سکتے" (ص ۲۴۲ تذکرۃ الرشید ج ۲)

دوسری طرف اسی زمانے میں اسی دلی میں حضرت شاہ عبد العزیز ہی کے معاصر یہ صوفی فدا حسین نامی تھے، جن کا تعلق فقیروں کے ایک خاص گروہ سے تھا، جسے لوگ "رسول شاہی" کہتے تھے، ان لوگوں کا حال کتابوں میں پڑھئے۔

بہرحال ان قصوں کو میں کہاں تک بیان کروں، یہ تو ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے، میں صرف مولوی و صوفی کی کشمکش کے ان نتائج کو مثالوں سے سمجھانا چاہتا ہوں، ملاحظہ کیجئے کہ ایک ہی دین کے پیرو، عوام نہیں بلکہ اس دین کے مختلف شعبوں پر کام کرنیوالوں کی جماعتی رقابتوں کی آگ ترقی کرکے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔

وہ بڑی مبارک و مسعود گھڑی تھی جس وقت سہارنپور میں بونبی کی مسجد کے پاس حضرت سید شہید کا گذر ہوا، اور حضرت شاہ عبد الرحیم ولایتی رحمۃ اللہ علیہ پر سید شہید کا اور سید شہید پر شاہ عبد الرحیم کی نسبتوں کا اثر پڑا، رخ وہیں سے بدلا، حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے ذریعہ مولویت و صوفیت کی یہی جنگ صلح کے قالب میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ ضریحہ تک پہنچی، چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے حالات اور انکی خصوصیات کے تذکروں میں لوگ اس قسم کی چیزوں کا ذکر عموماً پاتے ہیں، مثلاً مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کمالات امدادیہ میں فرماتے ہیں،

"حضرت صاحب (یعنی حاجی امداد اللہ ان کے مرشد) علماء کی، گو وہ حضرت کے خادم ہی کیوں ہوں، اس قدر توقیر فرماتے تھے کہ اکثر ان کی طرف سے جو ہدایا تحفے، حضور میں پیش ہوتے ان کو یہ کہکر کہ مولوی صاحب کا تبرک ہے اپنے سر پر رکھ لیتے، چنانچہ میرے روبرو بھی ایسا واقعہ پیش آیا" (کمالات امدادیہ ص ۳۲)

صورت میں مولویوں کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کی اس غیر معمولی تبدیلی کی توجیہ بجز اس انتساب گرامی کے اور کس واقعہ سے کی جائے جو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے توسط سے ان کو میسر آیا تھا، ازلی توفیق، کا مجھے انکار نہیں، بلکہ حضرت حاجی صاحب کے حالات میں اس غیبی لطیفہ کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، قصص الاکابر میں حضرت حکیم الامت تھانوی کی زبانی یہ منقول ہے کہ

حضرت (یعنی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ) نے خواب دیکھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، حضرت کی ایک بھاوج تھیں، وہ کھانا پکانے کا انتظام کیا کرتی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ تم ہٹو، ان کے (حاجی صاحب) کے مہمان علماء ہیں اور ان کی مہمانی ہمارے ذمہ ہے، ہم انتظام کریں گے۔" ص۶۱

اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، کہ "مولویت وصوفیت" کی جنگ کا اختتام کم از کم سرزمین ہند میں حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے لئے غیب ہی سے مقدر ہو چکا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہر غیبی واقعہ عالم شہادت کے اسبابی پردوں ہی کو چہرے پر ڈالے ہوئے نمایاں ہوتا ہے یہاں بھی اس غیبی لطیفہ کا ظہور مذکورہ بالا شکل میں ہوا۔

بلکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس قسم کے مکاشفات کا انتساب ان کے سوانح نگاروں نے جو کیا ہے، مثلاً حضرت حکیم الامت تھانوی نے اپنی کتاب "کرامات امدادیہ" میں مولوی عبد الغنی بہاری مرحوم کی کتاب "شمائم امدادیہ" کے حوالہ سے خود حضرت حاجی صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ طلب حق کے ابتدائی دنوں میں ایک دفعہ خواب میں بارگاہ رسالت پناہی کی سعادت حاجی صاحب کو حاصل ہوئی، خواب ہی میں دیکھتے ہیں کہ ان کے جدِ امجد جن کا اسم گرامی حاجی حافظ بلاقی رحمۃ اللہ علیہ تھا، وہی حاجی صاحب کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش فرما دیتے تھے، سننے کی بات اسی کے بعد آپ کے بیان کا یہ جزء ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ لیکر حوالہ حضرت میاں جیو صاحب چشتی (یعنی میانجی نور محمد جھنجھانوی قدس اللہ سرہ العزیز) کے کردیا"۔ ص ۲۷ کرامات امدادیہ

خواب میں یہ واقعہ اس زمانہ میں پیش آیا تھا کہ بقول حاجی صاحب کے

"اس وقت تک بعالم ظاہر حضرت میاں جیو صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سے کسی طرح کا تعارف نہ تھا"

اس کے بعد پھر میاں جیو صاحب کی خدمت میں حاضری کی تفصیل بیان کی ہے۔

میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی کے توسط سے حضرت سید احمد شہید کی عطا فرمودہ جو نعمت میاں جیو تک پہنچی تھی اس نعمت کی تقسیم عام کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ ہی کا انتخاب غیب میں کیا گیا تھا، اس کی تائید یقیناً عالم رؤیا کے اس مکاشفے سے بھی ہوتی ہے اور یہ قصہ تو اس وقت کا ہے جب تک میاں جیو صاحب سے حاجی صاحب کا تعارف بھی نہ ہوا تھا، میاں جیو کی غلامی میں داخل ہونے کے بعد تقریباً اسی مسئلہ کا اعادہ بجائے رؤیا اور خواب کے مراقبہ کی حالت میں حاجی صاحب کے سامنے جو فرمایا گیا ہے، اس کا تذکرہ بھی اسی کتاب کرامات امدادیہ میں کیا گیا ہے، یعنی حضرت حاجی صاحب خود فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ میں ایک دفعہ مسجد نبوی کے اس خاص مقام میں جسے روضہ جنت کہتے ہیں، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس کے متصل مسجد نبوی میں اُس جگہ واقع ہے جسے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سرہانا ہم کہہ سکتے ہیں، صحیح حدیثوں میں اس کو جنت کے باغوں میں کا ایک باغ فرمایا گیا ہے، بہر حال اسی "روضۃ من ریاض الجنۃ" میں حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میں مراقب تھا "مراقبہ" میں ان پر منکشف ہوا کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مقدس سے بصورت میاں جیو قدس اللہ سرہ (یعنی میاں نور محمد جھنجھانوی نکلے، اور عمامہ لپٹا ہوا اور تر یعنی بھیگا ہوا) اپنے دست مبارک میں لئے ہوئے تھے، میرے سر پر غایت شفقت سے رکھدیا اور کچھ

فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔" (کمالات صفحہ ۳)

تعلق سے پہلے بھی بارگاہ رسالت سے حاجی صاحب میاں جیو قدس اللہ سرہ کے سپرد کئے جاتے ہیں اور تعلق پیدا ہو جانے کے بعد بھی، میاں جیو ہی کی شکل میں مرشد حقیقی کی حقیقت حاجی صاحب کے سامنے جلوہ افروز ہوتی ہے، بلاشبہ یہ اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ غیب و شہادت کے تعلقات سے تھوڑی بہت سی واقفیت جو رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ "غیب و شہادت کے اتفاق" کے سوا اس کی دوسری توجیہ نہیں ہو سکتی، بلکہ "عمامہ" جو مولویت کی عام علامت ہے اس کو "تر" یعنی بھیگی ہوئی شکل میں حاجی صاحب کے سر پر جو رکھا گیا، فقیر کے ناقص خیال میں یہ "خشک مولویت اور صوفیت" کے اس اجماع کی طرف بہ ظاہر غیبی اشارہ معلوم ہوتا ہے[1]، جو حضرت حاجی صاحب کے مشرب ناب کا طغرائے امتیاز ہے، بہر حال کچھ ہو، یہ واقعہ ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

برنگ فقر چوں ملّائی آمد

بہ فیض ایمد او اللّٰہی آمد

لیکن واسطہ فی الفیض اس قصہ میں جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہی معلوم ہوتی ہے، ان ہی کے ذریعہ سے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا چڑھایا ہوا انقلابی رنگ حاجی صاحب قبلہ تک منتقل ہوا، بلکہ اسی کے ساتھ اگر حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے اس بیان کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے، "جو کرامات امدادیہ" میں براہ راست ان ہی کی طرف منسوب کر کے درج کیا گیا ہے، یعنی حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"ظاہر میں اول بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلوی خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی، اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی، کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] اگرچہ حکیم الامت قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سلوک بعد جذب و تمکین بعد تلوین و بقا بعد فنا" کی طرف اشارہ ہے ممکن ہے کہ اس کی طرف بھی اشارہ ہو ۱۲

ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں، اور حضرت سید احمد شہید کا ہاتھ آپ کے دست مبارک

میں ہے، اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کھڑا ہوں حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ

پکڑ کے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ میں دیدیا۔" صلا

اس سے تو واقعہ بالکل صاف اور یہ دعویٰ انشاء اللہ غیر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ کا وجود گویا ایک حیثیت سے حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا نقش ثانی، اور بروز صفائی تھا، اسی "نصب العین" کی تکمیل کے لئے قدرت نے ان کو چن لیا تھا، جس کے لئے بارہویں صدی کے مجدد کو اٹھایا گیا تھا۔

تمام شعبوں میں نہ سہی، مگر "صوفی وملا" کی باہمی رقابت اور طبقاتی کش مکش کے قصوں کو ختم کر کے فقیری میں ملائیت اور ملائیت میں فقیری کو سمونے اور جذب کرنے کی نظریاتی کوشش درحقیقت شاہ ولی اللہ نے فرمائی تھی، اسی میں عمومیت اور مسلمانان ہند کی اکثریت کو اسی مسلک کے زیر اثر لانے کی تکمیل کی ذمہ داری (جس کا آغاز سید شہید نے فرمایا تھا) کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون کے اسی فاروقی شیخ زادے کے سپرد کی گئی جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سے آج دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔

مرشد تھانوی حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ کے ملفوظات میں ایک سے زائد مقامات میں اس قسم کے فقرے ملتے ہیں، مثلاً قصص الاکابر میں ہے، مولانا تھانوی نے فرمایا

"حضرت حاجی (یعنی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) اپنے زمانہ میں مثل حضرت سید احمد کے تھے۔" صلا۶۶

ان دونوں بزرگوں میں منجملہ دوسرے اشتراکی وجوہ کے ایک خاص مشترک شان یہ بھی ہے کہ مولویت کے تعلیمی نصاب کی تکمیل کا رہین منت نہ حضرت سید شہید کا "دین مبین" تھا اور نہ حضرت حاجی صاحب کی دینی زندگی درسی کتابوں کی احسان مند تھی، حکیم الامت ہی کی طرف اسی کتاب میں جو یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ

"مثل شاہ سید احمد صاحب کے ابتدا ہی سے آپ کی (یعنی حضرت حاجی امداد اللہ کی)
ایسی حالت تھی" صلہ ۶۸ قصص الاکابر

اس کا مطلب بھی یہی ہے،

سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مذکورہ بالا معلومات جو پیش کئے گئے ہیں ان کو حافظہ میں محفوظ کرتے ہوئے اب سید شہید کے ان ہی ثنیٰ حاجی صاحب کی بابت سوانح قدیم کے مصنف امام کی ان فہمادتوں کو بھی سن لیجئے، حاجی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے وہ ارقام فرماتے ہیں کہ

"حضرت مخدوم (حاجی صاحب) کی نانہال ہمارے خاندان میں تھی" صلہ ۲۶

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ کی نانہال ہونے کا شرف نانوتہ کو حاصل تھا، بالفاظ دیگر یہ سمجھنا چاہئے کہ حاجی صاحب کا مادری وطن یعنی آپ کی والدہ ماجدہ کا گھر نانوتہ ہی تھا، صرف یہی نہیں، مصنف امام نے آگے لکھا ہے کہ

"اور بہن ان (حاجی صاحب) کی یہاں (نانوتہ میں) بیاہی تھیں" صلہ ۲۶

رشتے کے ان ہی تعلقات کا نتیجہ یہ تھا جیسا کہ وہی فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب

"اکثر نانوتہ تشریف لایا کرتے تھے" صلہ ۲۶

"کرامات امدادیہ" جو حضرت تھانوی کی تالیف ہے، اس میں مولانا محمد منیر نانوتوی کے متعلق ایک غیر معمولی واقعہ کا تجربہ درج کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مولوی محمد منیر صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے ہم عمروں میں تھے، وہی بچپن میں بیمار ہوئے، اطباء کی طرف سے سخت پرہیز کا حکم تھا، مہینوں بد پرہیزی کھانا کھاتے کھاتے تنگ آچکے تھے، اتفاقاً حضرت حاجی صاحب نانوتہ تشریف لائے، مولانا محمد منیر صاحب کی والدہ صاحبہ نے ان کی دعوت کی، دعوت کے کھانے میں حاجی صاحب نے مولوی محمد منیر کو صرف شرکت ہی کا حکم نہیں دیا، بلکہ فرمایا کہ جی بھر کر کھالو، دوسرے دن ان کی خالہ کے یہاں دعوت ہوئی، وہاں بھی یہی حکم

نئے قوانین و قواعد والی اس درسگاہ کے تجربہ کا موقعہ بھی میسر آیا اور بعد کو جیسا کہ سرسید احمد خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، مولانا مرحوم اس کالج کے تدریسی اسٹاف میں شریک ہوگئے۔

سید صاحب کے الفاظ مولانا مملوک العلی کے متعلق یہ ہیں کہ

"اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہجہان آباد میں عہدہ مدرسی رکھتے تھے۔ لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں، کہ مدرسی اول اس سے عبارت ہے" منہ

جس کا مطلب یہی ہوا کہ شروع میں مولانا مملوک العلی کا تقرر صدر مدرسی پر نہیں ہوا، بلکہ [ل] ہیڈ مولوی کی ماتحتی میں مددگاروں کی حیثیت سے اس کالج میں چند مولوی جو کام کرتے تھے۔ ان ہی مددگاروں میں ایک مددگار مولوی مدرس کی حیثیت کالج میں آپ کی تھی، لیکن چودہ پندرہ برس بعد اپنی خاص امتیازی قابلیت اور شاید اس لئے بھی کہ مولانا رشید الدین خاں کے رشید شاگرد شہر دہلی میں وہی سمجھے جاتے تھے، مولانا رشید الدین کی وفات کے بعد آپ ہی کا انتخاب صدارت کی اس جلیل خدمت کے لئے ہوا۔

جیسا کہ میں نے حاشیہ میں لکھا ہے قطعی طور پر یہ کہنا تو دشوار ہے کہ ابتدائی تقرر مولنا مملوک العلی صاحب کا کالج میں جب ہوا تو اس وقت آپ کی تنخواہ کیا تھی، لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ پچاس پچاس روپے کی دو اسامیوں میں سے کسی ایک اسامی پر آپ کا تقرر ہوا تھا تو گو اس زمانہ کے لحاظ سے اس تنخواہ کی ظاہر ہے کہ کوئی اہمیت نہیں ہے، اب جبکہ کالج

[ل] مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" میں لکھا ہے کہ ہیڈ مولوی جس کی تنخواہ ایک سو روپے ماہوار تھی، ان کے سوا دتی کالج میں پچاس پچاس روپے کے دو مولویوں کے سوا پچیس پچیس تیس تیس روپے ماہوار پانے والے اور بھی چند مولوی تھے، یقینی طور پر تو اس کا پتہ نہ چلا کہ مولانا مملوک العلی کا تقرر مددگار مدرسی پر جب ہوا تھا تو اس وقت ان کی تنخواہ کیا تھی مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ابتدائی تقرر غالباً پچاس روپیہ ماہوار والی جگہ پر ہوا ہوگا، اسی لئے صدارت کے عہدے پر ترقی میں آسانی ہوئی کہ مقابلہ میں صرف ایک ہی آدمی تھا ۱۲

آغازِ سوانح

نسب نامہ

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا نسبی سلسلہ شاہجہانی عہد کے عالم مولوی محمد ہاشم صاحب پر منتہی ہوتا ہے جو جاگیر پاکر نانوتہ میں آباد ہوئے، صدیقی شیوخ اس قصبہ کے عموماً ان ہی مولوی ہاشم کی اولاد میں ہیں، سوانح قدیم کے مصنف امام نے مولانا مرحوم کے شجرۂ نسب کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"محمد[۱] قاسم بن اسد[۲] علی بن غلام[۳] شاہ بن محمد[۴] بخش بن علاء[۵] الدین بن محمد[۶] فتح بن محمد[۷] مفتی بن عبد[۸] السمیع، بن مولوی[۹] محمد ہاشم" ص ۲۵

جس کا مطلب یہ ہوا کہ درمیانی سات واسطوں سے مولانا مرحوم کا نسب مولوی محمد ہاشم سے جاکر مل جاتا ہے، یہ تو گذر چکا کہ مولوی ہاشم صاحب کی جاگیر میں چند دیہات تھے، لیکن حکومتوں کے انقلاب سے جیسا کہ مصنف امام نے لکھا تھا،

مولوی محمد ہاشم صاحب کی پچھلی نسلوں کی معاشی حیثیت بگڑ گئی، اسی کے ساتھ یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ جاگیر خواہ جتنی بڑی بھی ہو، لیکن مسلمانوں میں وراثت کا جو عام قانون ہے، اُس کی وجہ سے تقسیم ہو ہو کر جاگیریں اور جائدادیں عموماً اپنی بڑائی کو قدرتاً کھوتی رہتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو حکومتوں کے انقلاب کا بھی اثر ہوا اور کچھ قانون وراثت کے تحت مولوی محمد ہاشم کی اولاد کی وہ حالت باقی نہ رہی، جو ابتدا میں تھی، ظاہر ہے کہ اس حادثے کے شکار جیسے دوسرے خاندان ہوئے اسی طرح مولٰنا محمد قاسم جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے، اس خاندان کا بھی حصہ رسدی کے مطابق متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

مگر اسی کے ساتھ مصنف امام ہی نے ایک خبر دی ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تقریباً چار پشتوں سے مولٰنا محمد قاسم کے خاندان میں اتفاقاً مسلسل یہ عجیب صورت

باقی جن دوسری معلومات کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں کہ دہلی سے واپسی کے بعد جیساکہ مصنف امام کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے شیخ اسد علی صاحب جب نانوتہ اپنے وطن تشریف لائے تو جیساکہ چاہیے تھا دلی سے تعلیم پاکر واپس لوٹنے والے اس نوجوان پر لوگوں کی نظریں پڑنے لگیں، سب کا حال تو معلوم نہ ہو سکا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نانوتہ ہی کے رہنے والے ایک وکیل صاحب جن کا اسم گرامی شیخ وجیہ الدین تھا، اور اپنے علاقے کے ضلع یعنی سہارنپور میں وکالت کرتے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں انگریزوں نے سہارنپور میں حکومت کا نظم قائم کیا تو شیخ وجیہ الدین

"سہارنپور میں وکیل ہوئے، اور نہایت عزت واحترام و تمول سے گذران کی" ص۲۵ سوانح قدیم

یہی وکیل صاحب جو عزت واحترام کے ساتھ "تمول" میں بھی نمایاں حیثیت کے مالک تھے مصنف امام کا بیان ہے کہ

"وہ (شیخ وجیہ الدین نانوتوی) فارسی بہت عمدہ جانتے تھے اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے، بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی تھے" ص۲۵

بہرحال کہنا یہ ہے کہ ان ہی شیخ وجیہ الدین صاحب وکیل نے شیخ اسد علی صاحب کو اپنی دامادی کے لئے قبول فرمایا، اور ان کا عقد وکیل صاحب کی صاحبزادی صاحبہ سے ہوگیا، اسلام کی یہی عفیفہ خاتون وہ خوش بخت، بلند اختر بیوی صاحبہ ہیں، جن کو سیدنا الامام الکبیر النانوتوی قدس اللہ سرہ کی والدہ ماجدہ ہونے کا تاریخی شرف وامتیاز قدرت کی طرف سے عطا ہوا،

میں پوچھتا ہوں کہ شیخ اسد علی صاحب اگر واقعی ہل جوتنے والے گنوار کسان تھے تو کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ شیخ وجیہ الدین صاحب متمول عزت واحترام رکھنے والے تعلیم یافتہ

وجیہ الدین ان کے خسر بھی تھے، جب وہ وکالت کرتے تھے تو وکالت یا اسی قسم کی دوسری سرکاری خدمات میں حصہ نہ لینے میں یہ سوچنے کی بات ہے، کون سی چیز مانع ہوئی؟

بعض روایتیں یا حکایتیں اس سلسلہ میں جو مشہور ہیں، مثلاً ارواح ثلاثہ میں بعض ثقات کی تحریروں کے حوالہ سے ایک روایت پائی جاتی ہے کہ

"ایک مرتبہ مولانا نانوتوی کے والد ماجد (شیخ اسد علی) نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ سے شکایت کی، کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا تھا، اور مجھے کیا کچھ امیدیں تھیں، کچھ کماتا تو افلاس دور ہو جاتا، تم نے خدا جانے کیا کر دیا کہ نہ کچھ کماتا ہے اور نہ نوکری کرتا ہے۔" صفحہ ۲۰۱

اسی طرح اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ مولانا نانوتوی نے اپنے والد کی زندگی میں جب اپنی موروثی جائداد کے متعلق شرعی نقطۂ نظر سے نظر ثانی کر کے کئی کئی پشتوں کے محروم الارث لوگوں تک ان کے جائز شرعی حصوں کی واپسی کا نظم فرمایا، تو اُن کے والد شیخ اسد علی صاحب کیلئے مولانا کا یہ طرز عمل باعث گرانی ثابت ہوا، کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی حاجی صاحب قبلہ قدس اللہ سرہ سے شیخ اسد علی صاحب نے شکایت کی کہ

"دنیا کی اولاد اپنے گھروں کو بھرتی ہے، اور یہ (مولانا محمد قاسم) "گھر کھوو" پیدا ہوا ہے کہ بنی بنائی جائداد کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔" (ماخوذ از تحریری یادداشت مولٰنا محمد طیب الحمید)

یہ اور اسی قسم کی دوسری روایتوں سے جیسا کہ ظاہر ہے، عام خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے اور شاید دوسروں کا یہی خیال ہو بھی کہ فطرتاً مولٰنا نانوتوی کے والد ماجد طالب دنیا اور جیسا کہ عام مسلمانوں کا حال اس زمانے میں ہو گیا تھا کہ جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر "جو کچھ مل جائے لئے چلے جاؤ" اسی حال میں وہ بھی گرفتار تھے۔

بلا شبہ مذکورہ بالا روایات کا اقتضا یہی ہے، مگر میں کیا کروں، میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ آخر جب ان پر طلب دنیا کا جذبہ اسی طرح سے سوار تھا، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، تو اسی زر کشی

اور دنیا طلبی کے وسیع امکانات جو اُن کے سامنے کھلے ہوئے تھے، ان امکانات سے مستفید ہونے میں انھوں نے گریز کی راہ قصداً کیوں اختیار کی، ان سارے امکانات پر لات مار کر تمام عمر کھیتی کی، ان چند لفظوں میں ان کی پوری سوانح عمری سمٹ کر کیوں ختم ہوگئی۔

الحمد للہ کہ نظریۂ آبائیت[1] کی آلودگی سے قرآن نے مسلمانوں کی ذہنیت کو پاک کردیا ہے آذر سے ابراہیم، اور نوح سے پسر نوح کی پیدائش کے قرآنی قصوں نے کسی بڑے کے باپ یا بیٹے ہونے کی ان کے نزدیک کوئی قیمت باقی نہیں چھوڑی ہے، حضرت یوسفؑ کے بھائی بھی جب اخوان یوسف بن سکتے ہیں، تو رشتہ کی قربت اور نزدیکی کا رعب یقیناً بے معنی رعب بن کر مسلمانوں کے لئے رہ گیا ہے، اسی صورت میں آئندہ جو کچھ میں عرض کروں گا، اس کے متعلق کسی خوش اعتقادی کے مغالطہ کا خیال خود مغالطہ ہوگا، بلکہ شواہد اور تاریخی روایات کی روشنی نے جس نتیجہ تک مجھے پہنچایا ہے محض اس کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم کے متعلق جو سوال میں نے اٹھایا ہے غور و فکر کے بعد اس سوال کا جو جواب مجھے ملا ہے، ممکن ہے کہ دوسروں کو شاید مولٰنا نانوتوی کے ساتھ میری خوش عقیدگی کی شدت اس جواب میں دخیل

[1] یہ میری ذاتی اصطلاح ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے، قرآن نے ایک سے زائد مقامات میں دو خاص طبقوں کا ذکر کیا ہے جنمیں ایک کی خصوصیت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ حق کا معیار ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ ان کے باپ دادا اسکو حق ملنتے تھے ماوجدنا علیہ اٰباءنا الاولین (جس پر ہم نے اپنے اگلے باپ دادوں کو پایا) یہی حق کا سب سے بڑا معیار ان کے نزدیک تھا، اسی نظریہ کی تعبیر میں "آبائیت" سے کرتا ہوں جو شخص خود والد بننے والا ہے اُسکے لئے یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ کسی چیز کو اسلئے حق قرار دے رہا ہے کہ اسکے والد مرحوم اسی کو حق خیال کرتے تھے، اسکے مقابلہ میں دوسرا طبقہ وہ ہے جسے میں "افکیہ" کہتا ہوں، ان کے نزدیک کسی چیز کے غلط ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ پہلے زمانہ کے لوگ اس کو حق تسلیم کرتے تھے، قرآن میں ہے کہ ان ھذا الا افک قدیم نہیں ہے یہ مگر پرانا جھوٹ) اسی مقدمہ کو کسی حقیقت کی تغلیط کے لئے وہ کافی خیال کرتے تھے، افک کے لفظ کی طرف منسوب کرکے میں نے اس طبقہ کا نام "افکیہ" رکھ چھوڑا ہے، اسی مقدمہ کی تعبیر وہ کبھی ان ھذا الا اساطیر الاولین (نہیں ہے یہ مگر اگلوں کے اسطورے یا قصے) کے الفاظ میں بھی کرتے تھے، یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت تک یہ دونوں متقابل طبقات تقریباً دنیا کے اکثر اقوام و ممالک میں پائے جاتے ہیں ۱۲

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی مولٰنا رفیع الدین صاحب مرحوم کی طرف منسوب کر کے ارواح ثلاثہ میں بروایت مولانا نظام الدین حیدر آبادی مرحوم جو یہ قول ان کا پایا جاتا ہے یعنی مولانا رفیع الدین حضرت نانوتوی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ

میں نے انسانیت سے بالادرجہ ان کا (مولانا نانوتوی کا) دیکھا' وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا' جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا تھا" ص۱۸۳ ارواح ثلاثہ

مولٰنا رفیع الدین کہتے تھے کہ اسی احساس اور یافت کا یہ اثر اور نتیجہ ہے

"میں پچیس ۲۵ برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں' اور کبھی بلا وضو نہیں گیا"

یہ ایک ایسی شخصیت کی شہادت ہے' جس کے قرب و ولایت کی تصدیق اس کے عہد کے اللہ والوں نے کی ہے۔

اور مولانا رفیع الدین کے متعلق تو ممکن ہے کہ قرب و صحبت کی وجہ سے شدت گرویدگی کا شبہ بھی کیا جائے' لیکن حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہ العزیز جو حضرت نانوتوی سے عمر میں تقریباً چونتیس سال بڑے[۱] تھے' گویا مولٰنا گنج مراد آبادی کے مقابلہ میں مولانا نانوتوی بچے تھے' دونوں حضرات میں تلمذاً یا ارشاداً کسی قسم کا ظاہری تعلق بھی نہ تھا' بلکہ جہاں تک میں جانتا ہوں ایک کی دوسرے سے شاید شفاہی ملاقات بھی نہ تھی' لیکن بایں ہمہ جانتے ہیں' حضرت گنج مراد آبادی جیسی بین الکرامات والکشوف ہستی نے مولٰنا نانوتوی کو کیا پایا تھا' حافظ تجمل حسین مرحوم دسنوی نے اپنی کتاب کمالات رحمانی میں حضرت گنج مراد آبادی سے براہ راست یہ الفاظ سن کر نقل کئے ہیں یعنی مولٰنا نانوتوی کے ذکر پر حضرت گنج مراد آبادی نے فرمایا۔

"اس کم سنی میں ان کو ولایت ہو گئی" ص۱۲۲ کمالات رحمانی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جتنے بھی شریک تھے سبھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو حال لوگوں پر طاری ہوا حافظے سے یہ کیفیت کیا نکل سکتی ہے مولانا شبیر احمد صاحب تک چیخ مار کر چت گرے ہوئے تھے' ہر ایک کا ہوش تھا' مفتی صاحب قبلہ بار بار اسی آیت کی تکرار فرماتے جاتے تھے"

(متعلقہ صفحہ ہذا) [۱] حضرت گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہ العزیز کی ولادت ۱۲۰۸ھ میں ہوئی اور مولانا نانوتوی ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے"

ہے تو یہ مختصر سا فقرہ لیکن ہم جب سوچتے ہیں کہ پیدا ہونے کے بعد آدمی زندگی کی مختلف منزلوں سے گذرتا ہے، بچپن، جوانی، کہولت وغیرہ عام طور سے زندگی کے ان سارے ادوار میں لغزشوں سے قطعاً بے لاگ ہو کر گذر جانا آسان نہیں ہے، لیکن اب تک مولانا نانوتوی کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہی دشوار مسئلہ ان کے لئے اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ کہنے والا شاید یہ کہہ سکتا ہے کہ پانے والوں نے جس حال میں ان کو زندگی کے آخری دنوں میں پایا، تقریباً یہی حال ان کا جوانی میں بھی تھا، اور شاید بچپن میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولی بنے نہیں تھے، بلکہ ولی ہی پیدا ہوئے تھے، اور ان کی اسی پیدائشی ولایت نے اسی لئے کم سنی ہی میں فعلیت کی شکل اختیار کر لی تھی، جس کی شہادت وقت کی سب سے بڑی مکاشف ہستی نے ادا کی،

آخر میں پوچھتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے اُن کے والد بزرگوار یعقوب علیہ السلام نے

کذلک یجتبیک ربک	یوں ہی تیرا رب تجھے چن لے گا۔

کے الفاظ کے ساتھ جو بشارت سنائی تھی، تو حضرت یوسف کی اس اجتبائی شان پر استدلال جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے، اسی سے تو کیا گیا تھا کہ جو بڑائیاں عالم شہادت میں حضرت یوسف کے سامنے آئندہ زندگی میں آنے والی تھیں، غیب کے عالم میں وہی بڑائیاں مثالی رنگ میں بحالت خواب اُن کو دکھائی گئی تھیں۔

پھر آپ ہی سوچئے بیان کرنے والوں سے جب ایک نہیں بلکہ اس قسم کی متعدد روایتیں ہم تک پہنچتی ہیں مثلاً

سوانح قدیم ہی میں مصنف امام رقم طراز ہیں

(۱)

مولوی صاحب (یعنی حضرت نانوتوی رح) نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا

میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں"۔ ص۲۵

اور جیسے ایام طفلی ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام نے سورج چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے سامنے خواب میں سر بسجود پا کر اس خواب کا تذکرہ اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام سے فرمایا تھا جس کی تعبیر میں ان کے والد پیغمبر نے "مقام اجتبار" کی خوش خبری ان کو سنائی تھی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ حضرت نانوتوی نے بھی اپنے اس خواب کا تذکرہ اپنے جد امجد شیخ غلام شاہ صاحب سے فرمایا۔ جن کے متعلق گذر چکا کہ ذاکر و شاغل تھے اور خوابوں کی تعبیر یعنی تاویل الاحادیث کی نعمت ان کو عطا کی گئی تھی، اپنے پوتے کے اس خواب کو سن کر فرمایا کہ

"تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا، اور بہت بڑے عالم ہو گے اور نہایت شہرت ہو گی"۔ ص۲۵ سوانح قدیم

کیا اس تعبیر میں اسی اجتبائی رنگ کی جھلک نظر نہیں آتی،

(۲) اسی طرح ارواح ثلاثہ میں ہے۔

"مولانا محمد قاسم صاحب نے بچپن میں ایک خواب دیکھا کہ میں مرگیا ہوں، اور لوگ مجھے دفن کر رہے ہیں، تب قبر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، اور کچھ نگینے سامنے رکھے، اور یہ کہا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں، اس میں ایک نگینہ بہت خوش نما اور کلاں ہے، اس کو فرمایا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے"۔ ص۲۰۰

میرے خیال میں یہ خواب بھی جو بچپن ہی میں حضرت کو دکھایا گیا تھا، عالم شہادت کے اس واقعہ کا جسے آج دنیا بچشم سر دیکھ رہی ہے، اسی کا یہ مثالی عکس تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تو ہے کہ انی جاعلک للناس اماما (یعنی خدا نے کہا کہ تمہیں لوگوں کا میں امام بناؤں گا) کا وعدہ اُن سے کیا گیا، اور یہ وعدہ

بوقت ضرورت اس سلسلہ میں مزید شواہد اور تائیدوں کو پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن اس وقت تک آپ کے سامنے جو کچھ پیش ہو چکا ہے، اس کے متعلق یہ سوچتے ہوئے کہ عموماً ان روایتوں کے راوی فہمیدہ وسنجیدہ حضرات ہیں، ان میں دارالعلوم دیوبند کے صدر اول حضرت تھانوی کے استاذ جلیل مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، اور ارواح ثلاثہ کی روایتوں کے راوی عمومی حضرت امیر شاہ صاحب سے ذاتی واقفیت جو نہیں رکھتے، وہ تو معذور ہیں، لیکن اس ملکوتی صفات ہستی کو جنھوں نے دیکھا اور برتا ہے، وہی جانتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کے متعلقہ روایات کے بیان کرنے میں وہ کتنے محتاط اور نزاکت پسند واقع ہوئے تھے، جہاں تک ان کے امکان میں تھا، عموماً ان ہی الفاظ کے دہرانے کی کوشش کرتے تھے جو ان بزرگوں سے ان کے کانوں تک پہنچے تھے، یہی چوتھی روایت یعنی کعبہ کی چھت والے خواب کو بیان کر کے خانصاحب مزید یہ اضافہ بھی کرتے تھے کہ

"میں نے یہ خواب اور اس کی تعبیر خود مولٰنا نانوتوی سے سنی ہے" ص۱۶۹

یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

"اس وقت میں اکیلا تھا اور پاؤں دبا رہا تھا، اور مولٰنا نے بے تکلف مجھ سے اپنا نام لیا۔"[1]

بہر حال یہ اور اسی قسم کے دوسرے قرائن وشواہد کی روشنی میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ العزیز ناسوتی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے وہ سب کچھ ہو چکے تھے، جس کا تفصیلی معائنہ اسی زندگی کی مختلف منزلوں میں دنیا کو کرایا گیا، بالفاظ دگر پیدا ہو کر وہ بڑے نہیں بنے تھے۔ بلکہ پیدائش سے پیشتر جن بڑائیوں سے وہ سرفراز ہو چکے تھے، پیدا ہونے کے بعد ان ہی بڑائیوں کا صرف ظہور ہوا تھا، انابت کے بعد ہدایت کی نعمت سے

---

[1] اس اضافہ کی ضرورت خاں صاحب کو اس لئے ہوئی تھی کہ حضرت نانوتوی کا عام دستور جیسا کہ خانصاحب ہی نے بیان کیا ہے، یہ تھا کہ اس قسم کے خوابوں کا ذکر عام محفلوں میں اگر آجاتا تو بجائے اپنے نام کے فرماتے کہ ایک شخص نے ایسا خواب دیکھا تھا ۱۲

"جب مولانا حجرۂ (ذکر) سے باہر قدم رنجہ فرماتے تو کسی روز چہرہ زرد زعفرانی اور ایسا ہیبت ناک ہوتا کہ دیکھنے والے کو ہیبت اور خوف غالب ہوتا، اور کبھی ایسا سفید و سرخ و صبیح و ملیح ہوتا کہ خواہ مخواہ طبیعت ہنسنے بولنے کو چاہتی۔" ص۱۵

دیوان جی کے اس بیان سے تو کچھ "گندمی رنگ" ہی کی تائید ہوتی ہے، ممکن ہے کہ جس زمانہ میں مولانا منصور علی خاں کو حضرت کے دربار کی حاضری کی سعادت میسر آئی ہو اس زمانہ میں چہرے کے رنگ میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا ہو، اور بجائے گندمی کے ان کو آپ کا رنگ سانولا محسوس ہوا ہو، آئندہ اس تغیر کے اسباب کا انشاء اللہ کچھ تذکرہ کیا بھی جائے گا، تاہم اس زمانہ میں آپ کا رنگ مولانا منصور علی خاں کو سانولا نظر آیا تھا، آپ کے اعضاء مبارک کا یہ رنگ بہر حال باقی تھا حکیم صاحب قبلہ ارقام فرماتے ہیں کہ

"ان کی دست بوسی اور قدم بوسی کے واسطے ہاتھ اور پیر کی نزاکت اور خوبصورتی کافی تھی وہ کچھ ایسے موزوں اور دل کش تھے کہ بے اختیار بوسہ دینے کو جی چاہتا تھا۔"

اپنے شفیق و رؤف استاد کے متعلق آگے ان کے والہانہ الفاظ قلم سے یہ نکل پڑے ہیں۔

"ان کی سی نزاکت اور دلبری کسی معشوق میں بھی نہ دیکھی" ص۱۹

(دیوبند، محمد علی قاسمی ۲۵۶)

مگر اعتدال مزاج کے جسمانی آثار چھاؤ اگر ایک طرف یہ تھے، تو دوسری طرف اسی شفاف و نرم نازک دست و پا کے متعلق ان ہی حکیم منصور علی خاں صاحب کی چشم دید شہادت یہ بھی ہے، حج کے آخری سفر میں حکیم صاحب قبلہ کو بھی حضرت مولانا کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا تھا، انھوں نے لکھا کہ مناسک حج سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کے ساتھ مدینہ منورہ جا رہا تھا، تب خضرا جوں ہی نظروں کے سامنے ہوا حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ

"جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پا برہنہ چلنا شروع کیا، میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اتار ننگے پیر ہمراہ مولانا مرحوم چلنا شروع کیا۔"

سننے کی بات اسی کے بعد ہے، حکیم صاحب جو ذاتاً وصفاتاً پٹھان تھے، عمر بھی اس وقت ان کی زیادہ

مگر بہر حال اس "شعور" کا ظہور آپ ہی میں ہوا، بتایا جائے کہ "خداداد شعور" کے سوا اسے اور کیا قرار دیا جائے، اور نوشت و خواندہی کے دائرے تک یہ بات محدود نہ تھی، مصنف امام نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے" ص۲۷

آگے اپنی چشم دید گواہی قلم بند فرمائی ہے کہ

"ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو، یا محنت کا، سب سے اول اور غالب رہتے تھے۔"

حالانکہ ہوشیاری والے کاموں میں امتیاز حاصل کرنے والے "محنت" کے کاروبار میں عموماً پھسڈی ہی ثابت ہوتے ہیں، مگر یہاں دونوں باتیں آپ پر آسان کی گئی تھیں وہ "تعلیم گاہ" کے بھی یکہ تاز اور "بازی گاہ" کے بھی شہ باز تھے، بلکہ ایک لطیفہ اسی سلسلے میں مصنف امام نے جو بیان کیا ہے وہ اس لحاظ سے خاص طور پر مستحق توجہ ہے کہ اپنی دلچسپی کے ان دونوں میدانوں یعنی تعلیم گاہ و بازی گاہ دونوں میں ایک خاص قسم کے رشتہ اور ربط پیدا کرنے کی کوشش کا ایک نادر نمونہ ہے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے۔" ص۲۷

بچپن میں نظم یا کلام کو موزوں کرنے کا مذاق بجائے خود یہ تو کوئی اہم بات نہیں ہے، لیکن قصوں کے ساتھ

"اپنے کھیل"

کو بھی نظم کا لباس پہنا کر علم اور کھیل دونوں کے ذوق میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی شاید یہ ایک واحد تاریخی مثال ہے، بلکہ دوسری جگہ مصنف امام ہی نے ان کھیلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو مولانا بچپن میں کھیلا کرتے تھے یہ لکھتے ہوئے کہ

"خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل "جوڑ توڑ" نام ہم کھیلتے تھے، اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے، اور ہم نے کھیلنے والے مات

کھا جاتے تھے" ص۲۷

ان "نئے کھیلنے والوں اور مات کھا جانے والوں ہیں" جیسا کہ مصنف امام کے فحوائی کلام سے معلوم ہوتا ہے خود حضرت مولنا بھی تھے، شاید شکست کی ندامت حد سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی، پھر آپ جانتے ہیں کیا کیا گیا! یہ تو آپ سن ہی چکے کہ "کھیل کو بھی نظم کا لباس پہنا کر علم اور کھیل میں رشتہ قائم کیا جاتا تھا" اب سنئے، مصنف امام فرماتے ہیں

"مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحبؒ) جب اس کا (یعنی جوڑ توڑ کے اس کھیل کا قاعدہ معلوم کر لیا پھر یاد نہیں کہ کسی سے مات کھائی ہو، بہت ہوا تو برابر رہے" ص۲۷

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ جزئیات سے کلیات بنانے کی مشق کا موقعہ تو ان کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں بعد کو ملا، مگر ابھی جب مکتب ہی کی زندگی نانوتہ میں بسر کر رہے تھے، اس میں بھی "جوڑ توڑ" کے کھیل کے بنیادی کلیات کی سراغ رسانی کا کام شروع ہو چکا تھا، اور بالآخر اس "کلی قاعدے" کو معلوم کر کے پرانے کرید مشاق کھیلنے والوں کو چت کرنے لگے، کھیل کود کے ساتھ اس حکیمانہ رجحان کا امتزاج کچھ "جوڑ توڑ" ہی کی حد تک محدود نہ رہا، مصنف امام نے آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"بلکہ ہر کھیل کا جو مرتبۂ کمال ہوتا وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے" ص۲۷

اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ قانون آفرینی اور کلیت سازی کا یہ ذوق ان تمام کھیلوں پر محیط ہو گیا تھا، جن کا نانوتہ کی بازی گاہوں میں اس وقت رواج تھا، شاید نظم کا لباس ان ہی "کلیات" کو عطا کیا جاتا تھا، افسوس ہے کہ کوئی معمولی نمونہ بھی ان نظموں کا ہم تک نہ پہنچ سکا، ورنہ "ملاعب الصبیان" یا لڑکوں کے کھیل کی تاریخ کی وہ کوئی دلچسپ چیز بلکہ شاید اپنی آپ نظیر ہوتی، نیز بچوں کے کھیل کی جن دو مستقل قسموں کی طرف مصنف امام نے اشارہ کیا ہے، یعنی ایک قسم ایسی کھیلوں کی ایسی تھی جن کا تعلق ہوشیاری سے تھا، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ بچوں کی فکری و ذہنی قوت کی نشو و نما میں ان سے مدد ملتی تھی، اور دوسری قسم ان ہی کھیلوں کی وہ بھی تھی جس کا تعلق جسمانی محنت و مشقت سے تھا، انگریزی عہد کئے "یا فٹ بال، کرکٹ کے زمانے سے پہلے ہمارے

دیوبند میں آپ کو کہاں رکھا گیا، اگرچہ اس کا واضح جواب مصنف امام کی کتاب میں نہیں ملتا لیکن مولانا محمد طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قلمی یادداشت میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"دیوبند میں آپ کی (یعنی مولٰنا نانوتوی) کی چند قرابتیں قریبہ بلکہ اقرب ہیں۔"

یہ خبر دیتے ہیں کہ

"شیخ کرامت حسین کے یاں جن سے مسلسل رشتہ داریاں تھیں قیام کیا۔"

اس سے زیادہ صریح شہادت اور کیا ہو سکتی ہے، اسی لئے ماننا چاہئیے کہ حضرت الاجب پہلی دفعہ اپنی طفولیت کے اس عہد میں دیوبند تشریف لائے، تو موجودہ دارالعلوم کی عمارت سے جو بالکل متصل حویلی شیخ کرامت حسین کی تھی، یہی آپ کی فرودگاہ قرار پائی۔

گھوم گھوم کر ذہن اس گذرے ہوئے زمانہ کی طرف چلا جاتا ہے، جب دیوان محلہ میں پہلی دفعہ حضرت والا نے نزول اجلال فرمایا، اس ڈیوڑھی کی مغربی سمت والی زمین جواب دارالعلوم قاسمیہ کی فلک پیما عمارتوں سے بھری ہوئی ہے، دارالحدیث کا قبہ بیض دور دور سے نظر آتا ہے، یہ کون جانتا تھا کہ اس غیر آباد زمین پر اسلامی ہند کی دینی تاریخ کا اتنا بڑا ہنگامہ اسی ننھے منے بچے کے ہاتھوں برپا ہونے والا ہے، انسان کے سوا وہ ساری چیزیں جنکی تسبیح کو قرآنی نص کی رو سے ہم نہیں سمجھتے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس سلسلہ کی چیزیں اس میدان یا باغ میں جو پھیلی ہوئی تھیں، ان میں سرگوشیاں نہ ہوتی ہوں گی۔

"سلام ہو تجھ پر اے ہمارے آباد کرنے والے ہمیں متبرک بنانیوالے بچے۔"

کم از کم شعر کے کانوں میں اس سلام کی آواز اب بھی گونج رہی ہے۔ شاعر کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس خطے کا ذرہ ذرہ، جڑی بوٹی، شجر و حجر آنیوالے کا استقبال کر رہے ہیں، اپنے آباد کرنیوالے کے قدم چوم رہے ہیں۔

خیر بے ساختہ خیالات کا ہجوم ہے جو دل و دماغ پر چھاتا چلا جاتا ہے، اپنی ذہنی لذتوں کو اپنی ہی حد تک محدود رکھنے میں کچھ بخل کی بو محسوس ہوئی، اس لئے اضطراراً قلم سے یہ الفاظ ٹپک پڑے آئیے اب اصل قصہ کو سنئے، قیام کا نظم بھی شیخ کرامت حسین مرحوم کی اس ڈیوڑھی میں ہوا، اور گو

ل۱ کاش مولانا طیب صاحب فٹ نوٹ میں ان قرابت داریوں کی کچھ تفصیل فرما دیتے تو مناسب تھا!

کرامت حسین جو بڑی بڑی براتوں کو مہمان بنا لینے کے عادی تھے، ان کے متعلق تو اس قسم کا وہم بھی شاید وہم سے بھی زیادہ بدتر بات ہوگی۔

شیخ کرامت حسین مرحوم کی فراغبالی اور سیر چشمی، مہمان نوازی وغیرہ فضائل کے جو قصے عام طور پر مشہور ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھ میں تو یہی آتا ہے، کہ اپنے معصوم کمسن مہمان کے آرام و آسائش اور ہر قسم کی سہولتوں کا وہ ضرور خیال کرتے ہوں گے، مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کے امیرانہ گھرانوں میں قدرتاً کھانے والوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، خصوصاً اس زمانہ میں کہ ہلکا سا تعلق بھی کسی کے گھر مہمان بن جانے اور مہینوں پڑے رہنے کے لئے کافی تھا، میزبان کو بجائے گرانی کے خوشی ہوتی تھی کہ اس باورچی خانہ سے اتنے آدمی مستفید ہوتے ہیں، اب اسے آپ اچھی رسم قرار دیں یا بری، مگر واقعہ کی صورت اس زمانہ میں کچھ یہی تھی گو "سفرۂ عام" کا یہی ذوق بعض شرمیلے کم سخن مہمانوں کے لئے باعث کلفت بھی بن جاتا تھا۔ جس کا میرے نزدیک ایک نمونہ یہ واقعہ ہی ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد طیب صاحب نے عہد طفلی کے اسی قیام دیوبند کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی قلمی یادداشت میں مندرجہ ذیل روایت کو خود حضرت نانوتوی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے کہ

"مولٰنا مرحوم (یعنی حضرت نانوتوی) فرماتے تھے کہ میں نے کبھی تازہ باسی روٹی یا دانہ دُنکا مٹھائی کھٹائی اپنی زبان سے نہیں مانگی، اگر کسی نے دے دیا لے لیا، اور کھا لیا، ورنہ خیر، بعض دفعہ بھوک بہت لگتی، مگر مانگنے کی تکلیف کو بھوک کی تکلیف پر گوارا کر کے صبر کرتا، اور جب مہینہ دو مہینے میں دو چار روز کے واسطے گھر نانوتہ جاتے اور پھر دیوبند کی واپسی کا وقت قریب آتا، تو آپ بھوک کی تکلیف یاد کر کے بہت روتے، آپ کی والدہ ہر چند پیار کر کے چمکار کے پوچھتیں کہ تجھ کو دیوبند میں کچھ تکلیف ہے۔ مولٰنا فرماتے کہ میں نے اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ اگر میں نے والدہ سے اس تکلیف کا ذکر کیا تو دیوبند والوں کی ناشکری ہوگی، اور ان کو رنج گذریگا،

اپنے نفس پر تکلیف کا ہونا، مضائقہ نہیں، والدہ کو اصل حال سے مطلع نہیں کیا،
اور برابر اسی طرح گذاری"۔

ظاہر ہے کہ براہ راست خود حضرت نانوتوی سے یہ قصہ یقیناً مولانا طیب نے نہیں سنا ہے، بلکہ روایت بالواسطہ ہے، راوی کا نام بھی نہیں بتایا گیا ہے، پھر روایت باللفظ بھی نہیں بلکہ بالمعنی ہے، تاہم اس روایت سے پہلی بات تو دہی ثابت ہوتی ہے کہ شیخ کرامت حسین مرحوم کے یہاں آپ کا قیام فیملی گسٹ یا معاوضہ ادا کر کے رہنے والے مہمانوں کی طرح نہ تھا، اور قیام کے ساتھ ان ہی کے یہاں طعام کا بھی نظم تھا، رہی بھوک کی تکلیف؟ سو خود مولانا ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تکلیف میں زیادہ دخل خود ان کی شرمیلی فطرت اور نہ مانگنے کی عادت کو تھا، بھلا آٹھ نو سال کی عمر میں جس کا دماغ یہ فلسفہ بناتا ہو، کہ بھوک بھی تکلیف ہے اور مانگنے کی ذلت یہ بھی تکلیف ہے، پھر دونوں تکلیفوں میں موازنہ کر کے یہ فیصلہ کہ بھوک کی تکلیف مانگنے کی ذلت کی تکلیف کے مقابلہ میں قابل برداشت ہے، اندازہ کیجئے کہ اس کے اخلاقی احساسات کی نزاکتوں کا کیا حال ہوگا، بھوک کی تکلیف جسمانی تکلیف ہے، اور ذلت و بے آبروئی، یہ روحانی تکلیف ہے، یہ فیصلہ اسی کا قلب سلیم کر سکتا ہے، اور وہ بھی کم عمری کے اس زمانہ میں، جس کے سارے اخلاقی احساسات جبلۃً بیدار ہوں، اس عمر میں بھی جس میں بچوں کی ساری ضرورتوں کی تکمیل کا دارومدار اپنے بڑوں سے مانگنے ہی پر ہوتا ہے، مانگنا ہی نہیں بلکہ مانگنے پر اصرار، بے جا ضد، ہٹ، اس عمر کا عام اقتضاء ہے، مگر جس کا حال یہ ہو خود بیان کرتا ہو کہ کسی سے کبھی کوئی چیز مانگی ہی نہیں، اگر اپنے اس فطری غریزہ کی وجہ سے گھر میں بھی بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہونے پر اسے مجبور ہونا پڑے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے اور شیخ کرامت حسین کا گھر خواہ قریب ترین عزیزوں ہی کا گھر کیوں نہ ہو، مگر اپنا گھر تو وہ یقیناً نہ تھا، مگر اس تکلیف کا شکار وہاں ان کو ہونا پڑا، تو جہاں تک میرا خیال ہے، اس کی ذمہ داری میزبان سے زیادہ غریب میزبان کے اس عجیب و غریب

عربی شروع کرائی، مزید اور کچھ نہ معلوم ہو سکا، لیکن اسی سے اس کا پتہ چلا کہ نانوتہ سے جس وقت آپ باہر نکلے ہیں، اس وقت اتنی لیاقت اور قابلیت آپ میں پیدا ہو چکی تھی کہ عربی شروع کرانے کی صلاحیت مولوی مہتاب علی صاحب نے آپ کے اندر پائی، عربی شروع کرانے کا مطلب اس زمانہ کے لحاظ سے یہی ہو سکتا ہے کہ میزان و منشعب کے ذریعہ عربی صرف آپ سیکھنے لگے، جاننے والے جانتے ہیں کہ تھوڑی بہت فارسی جانے بغیر صرف کی ان ابتدائی کتابوں کو کوئی پڑھ نہیں سکتا اس لئے ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ نانوتہ سے جس وقت باہر قدم آپ نے رکھا، اس وقت کم از کم میزان منشعب تک کے سمجھنے کی قابلیت فارسی ادب میں آپ حاصل کر چکے تھے، اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آئندہ دیوبند کے بعد سہارنپور پہنچکر پڑھنے کا جو مرحلہ پیش آیا جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، اس میں عربی کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "فارسی" کی کتابیں بھی سہارنپور میں آپ نے پڑھیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ فارسی ادب کا کامل رواجی نصاب ابھی پورا تو نہیں ہوا تھا، مگر میزان و منشعب جیسی کتابوں کی فارسی عبارت کے سمجھنے سمجھانے کا سلیقہ آپ میں پیدا ہو چکا تھا۔

دیوبند کے اس مہتابی مکتب کے ایام طالب العلمی کا ایک لطیفہ یہاں قابل ذکر ہے، مولانا طیب الحفید سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس لطیفہ کا تذکرہ اگرچہ ضمناً سرسری طور پر قلمی یادداشت میں فرمایا ہے، مگر جس طریقہ سے انھوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لطیفہ عام طور پر لوگوں میں مشہور و معروف تھا، بظاہر یہ ایک لطیفہ ہے، مگر میرے نزدیک وہ لطیفہ نہیں بلکہ حضرت والا کی اجتبائی شان کی جھلک اس میں بھی مجھے محسوس ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت نانوتوی کے متعلق عموماً یہ سمجھا جاتا ہے، اور آپ کی تصنیف کردہ کتابوں سے بھی ایک حد تک اسی کا اندازہ ہوتا ہے، کہ مطالعہ اور کتب بینی کا چنداں ذوق آپ نہیں رکھتے تھے آپ کی کتابوں کو پڑھ جائیے، زیادہ تر آپ کے ذاتی اجتہادی نتائج اور ایسی باتیں جنھیں آپ کی اپج ہم کہہ سکتے ہیں، ان سے عموماً آپ کی گرانمایہ تصنیفات لبریز نظر آئیں گی، رہا دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کا حوالہ یا اعادہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عادت نہیں تھی، انشاء اللہ حضرت والا کی

اس علمی خصوصیت پر تفصیلی بحث آئندہ کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ اس عام مشہور قصے کا واقعہ سے کس حد تک تعلق ہے؛

یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ کاغذ لیسی یا ورق گردانی جو مولویت یا علمی زندگی رکھنے والوں کا گویا ایک مرض ہے، یہ مانا جاتا ہے کہ اس مرض کے آپ مریض اور اس بیماری کے آپ بیمار نہیں تھے نہ صرف عوام بلکہ حضرت حکیم الامت التھانوی قدس اللہ سرہ العزیز تک بھری مجلسوں میں بغیر کسی جھجھک عموماً فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں"

ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں نظامیہ درس کا جو نصاب تھا اسکی تکمیل آپ نے نہیں فرمائی تھی، کیونکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، آپ کے تکمیلی نصاب کی کتابوں کی فہرست جو اپنے موقعہ پر درج ہو گی، اسی سے اس احتمال کی تردید ہو جاتی ہے، حضرت تھانوی سے بڑھ کر اس واقعہ کا علم اور کسے ہو سکتا ہے، بلکہ مقصد مبارک حکیم الامت کا یہی ہے کہ مطالعہ کے ذریعہ کتب بینی کی عام مولویانہ رسم سے آپ کو دلچسپی نہ تھی، اسی لئے کتابوں کے پڑھنے کا زیادہ موقعہ آپ کو نہ مل سکا، اور قصے کو حضرت تھانوی صرف اسی فقرے پر ختم نہیں فرما دیتے تھے، بلکہ آگے اس کا اضافہ بھی فرماتے کہ

"پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا" قصص الاکابر الہادی ماہ جمادی الثانی ۲۹ ۱۳۵۰ھ

اس وقت میری اصلی غرض کا تعلق حکیم الامت قدس اللہ سرہ کے بیان کے اسی جزء سے ہے ظاہر ہے کہ شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا" طالب العلمانہ زندگی کی طرف اس کا انتساب کوئی معمولی بات نہیں ہے، کامل اعتماد، اور غیر مشتبہ وثوق تام ہی کے بعد اتنی بڑی اہم شہادت کی گنجائش حضرت حکیم الامت جیسی ذمہ دار ہستی کے بیان میں پیدا ہو سکتی ہے، تواتر اور شہرت کی راہ سے جب تک یہ بات ان تک نہ پہنچی ہو گی، ہر گز وہ اسکی جرأت نہیں فرما سکتے تھے۔

اب ایک طرف رکھئے اس متواتر یا کم از کم مشہور خبر کو کہ حضرت نانوتوی نے پڑھنے کے زمانے

کہ مولوی مہتاب علی صاحب علم صرف کی تعلیم کے ساتھ کچھ خصوصی تعلق رکھتے تھے، جس کا کچھ اندازہ خودان کے برادر خورد حضرت شیخ الہند کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کی ادبی قابلیت سے بھی ہوتا ہے ؎

کچھ بھی ہو، میرا خیال یہی ہے، اور مختلف قرائن وقیاسات کی تائید اس خیال کو حاصل ہے کہ دلی پہنچنے کے بعد "ترکیبوں" کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر "صیغوں" کے پہچاننے اور جاننے میں مولانا نانوتوی بقول مصنف امام جو "سب میں عمدہ رہتے تھے" تو "سب سے" عمدہ رہنے کے اس امتیاز میں اگر کلیہ" نہیں تو اکثر وبیشتر حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیوبند کی مکتبی تعلیم ہی کو زیادہ دخل ہے، وہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی "بنیاد" شروع میں مضبوط اور مستحکم کر دی گئی، اور عربی صرف کی اسی استواری کا یہ نتیجہ اگر ہوا ہو، کہ عربی آمیز فارسی کی کتابوں تک آپ کے مطالعہ کا دائرہ وسیع ہو گیا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔

اس کا صحیح طور پر علم نہ ہو سکا کہ دیوبند کے اس مہتابی مکتب میں آپ کتنے دنوں زیر تعلیم رہے بہرحال یہ مدت جتنی بھی ہو، اس مدت میں بجز ان دنوں کے جو مہینہ دو مہینے بعد نانوتہ میں گذرتے تھے یعنی تین چار دن کے لئے جیسا کہ گذرا آپ گھر بلائے جاتے تھے، زیادہ حصہ اس عزیز اور قیمتی وقت کا دیوبند ہی میں گذرا، اور ٹھیک اسی محلہ میں گذرا، اسی خطہ میں گذرا جس کے سامنے آپ کا قائم کردہ دارالعلوم آج قائم ہے، سیدنا الامام الاستاذ مولنا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کتاب ارواح ثلاثہ میں دارالعلوم دیوبند کی موجودہ پرشکوہ عمارتوں کے متعلق یہ فقرہ جو درج کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ

حاجی صاحب مرحوم (یعنی حاجی عابد حسین مرحوم)[1] کے سامنے (دارالعلوم کا) وہ مستقبل

---

[1] قصبہ دیوبند کے خانوادۂ سادات سے آپ کا تعلق تھا، ان کا ذکر تفصیلاً اپنے موقعہ پر آئے گا، دارالعلوم دیوبند سے ان کا خصوصی تعلق ہے، ابتداءً میں حاجی صاحب کا خیال تھا کہ مدرسہ کے لئے دیوبند کی جامع مسجد کے حجرے کافی ہیں ۱۲

نہ تھا، جو حضرت (مولانا نانوتوی) کو نظر آرہا تھا، ان کی فراست کے سامنے یہ مکتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دارالعلوم ہونے والا تھا۔" صفحہ ۱۸۹

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار بساط قاسمی کے اخص الخواص بزرگوں میں تھا، ان بزرگوں کی زبان مبارک سے سنے ہوئے اس فقرے نے میرے ذہن کو ایک خاص خیال کی طرف منتقل کردیا، اگرچہ میرا یہ ایک ذاتی خیال اور ذہنی انتقال ہے، مگر اب جب کہ دیوبند کے اس مکتب سے حضرت والا کی روانگی کے ذکر کا موقعہ آگیا ہے، جی نہیں مانتا کہ اپنے اس ذاتی خیال کو اپنے خیال ہی کی حد تک محدود رکھوں۔

ذرا سوچئے، ان دنوں کو جب آج سے ایک صدی سے بھی پہلے دیوان محلہ کی عمارت کے اندر، یا اسی عمارت سے تعلق رکھنے والے ایک مکان میں مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب خانہ قائم ہے، اس ڈیوڑھی کے سامنے بسمت مغرب اسی وسیع وعریض خطے میں جس میں دارالعلوم کی بیسیوں عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں، بجائے ان عمارتوں کے وہاں کچھ میدان کچھ تالاب کچھ باغوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے، بچے مکتب سے چھوٹتے ہونگے، ان کے کھیل کود، سیر و تفریح کا طبعی مرکز سامنے کا یہی علاقہ ہوگا، ان ہی بچوں میں ایک "بچہ" وہ بھی تھا، جس کے لئے قدرت کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا کہ اسی علاقہ میں اسی بچے کے ہاتھوں سے چند سال بعد ایک عظیم الشان دارالعلوم کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا، اور ایک حد تک اپنی ہی زندگی میں بعض بلند و بالا عمارتوں کو اسی میدان میں اپنے سامنے کھڑی پائے گا، اس خیال کو پیش نظر رکھئے، اور اس کے بعد سوچئے کہ عمر پانے کے بعد جس بچے کے ہاتھوں واقعیت کا قالب جس کام نے اختیار کیا، اگر نوعمری اور طفولیت کے زمانہ میں اسی بچہ کے دل و دماغ میں اسی کا خیال، صرف خیال، اجمالی ہلکا سا خیال، اگر آیا ہو، تو کیا یہ ایسا خیال ہے جس کا ہم خیال بھی نہیں کر سکتے؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کہ حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے سامنے "وہ مستقبل نہ تھا، جو حضرت کو نظر آرہا تھا، اس سے اتنی بات تو بہر حال ثابت ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی طویل و عریض، بلند و بالا عمارتیں آج اس

قصبہ کے جس خطہ ارض میں ہر دیکھنے والے کو وقوع پذیر ہونے کے بعد نظر آرہی ہیں سیدنا الامام الکبیر کے ایک محرم اسرار عاشق زار کی یہ شہادت ہے کہ وقوع سے پہلے وہ ان کو دیکھ رہے تھے؟
بحث اگر کچھ ہو سکتی ہے تو اسی سوال پر، دارالعلوم کا اتنا تفصیلی خاکہ یعنی جو مکتب ہے، وہ مدرسہ، وہ مدرسہ بالآخر دارالعلوم بن جائے گا۔

ظاہر ہے کہ عہد طفولیت میں اس کی گنجائش مشکل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے بلکہ حضرت شیخ الہند نے جیسا کہ فرمایا ملکۂ فراست کے روشن ہونے کے بعد ہی یہ توقع کرنی چاہئے کہ اس کی روشنی میں اتنی وضاحت کے ساتھ مستقبل کی اتنی مفصل تصویر آپ کے سامنے آئی ہوگی، لیکن اس میں کچھ مضائقہ نہیں اگر ہم یہ سوچیں کہ مکتبی زندگی میں اپنے موجودہ مکتب سے زیادہ بہتر شکل میں درس گاہ کا خیال اسی میدان میں جو مکتب کے سامنے ہی تھا، کبھی کبھی آجاتا ہو، خصوصاً تعمیری وسعت کے لئے محلہ دیوان کی ڈیوڑھی کی عمارتیں تخیل کو سہارا دینے کے لئے وہیں موجود بھی تھیں۔

بہرحال اب اسے شاعری سمجھا جائے یا ایک قسم کا وجدانی احساس کہ دارالعلوم دیوبند کی عمارتیں آج جس علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں، کچھ تعجب نہیں اگر مکتبی زندگی میں حضرت والا کو کسی تعلیم گاہ کے قیام کا امکان کسی نہ کسی پیمانہ پر وہاں محسوس ہوا ہو، اور مناسب و موزوں حالات کی مسلسل آبیاریوں سے جن کا ذکر آگے آرہا ہے اسی اجمالی خیال کے تخم کی پرورش ہوتے ہوئے بالآخر ایک تناور درخت کی شکل اس نے اختیار کرلی ہو، اپنے اس خیالی احساس پر نسبتاً زیادہ زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے لئے دیوبند، اور دیوبند میں بھی اس خاص خطہ کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ مختلف کتابوں میں اس سوال کو اٹھایا گیا ہے، اللہ جس کی سمجھ میں جو توجیہ آئی ہے، وہ پیش کی گئی ہے[1]، آئندہ اس کتاب میں بھی

---

[1] دیکھئے کتاب "مسلمانوں کا شاندار ماضی" مؤلفہ مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبند ص ۶۲ حصہ پنجم۔ اور بھی مختلف کتابوں میں بحث مل سکتی ہے ۱۲

مجھے اس سوال پر بحث کرنا ہے، سچ پوچھئے تو اس بحث کی راہ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ آہستہ کتاب پڑھنے والوں کے لئے ہموار ہوتی چلی جائے، گویا یوں سمجھئے کہ اسی بحث کی اجمالی قسط آپ کے آگے رکھی گئی ہے، دارالعلوم کے سفرۂ عام یعنی مطبخ کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ اسی سلسلہ میں کیا گیا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اسی سوال کے جواب میں علاوہ دوسرے بزرگوں کے مکاشفات کے حضرت سید احمد مجدد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کشفی قصہ عموماً نقل کیا جاتا ہے۔

"حضرت سید احمد صاحب بریلوی جب سرزمین دیوبند سے گذرے تو اس زمانہ میں اس جگہ جہاں دارالعلوم قائم ہے کوڑیاں پڑا کرتی تھیں، سید صاحب نے فرمایا کہ یہاں سے علم کی بو آتی ہے۔" (مسلمانوں کا شاندار ماضی حصہ پنجم ص ۶۵)

فراست ایمانی کے نور سے کہتے ہیں، کہ حضرت مجدد الف ثانی پر بھی ڈھائی تین سو سال پہلے کچھ اسی قسم کی بات کھولی گئی تھی[1]۔ ایسی صورت میں اب خود خیال کیجئے کہ ایک اجنبائی روح کے متعلق خاکسار کے مذکورہ بالا احساس کو محض بے بنیاد قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، ہونہار بچوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے، ان کو دارالعلوم دیوبند کے محل وقوع کی بنیاد کا سراغ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی مکتبی زندگی کی گہرائیوں میں جہاں تک سمجھتا ہوں ڈھونڈھنے سے مل سکتا ہے، دیوبند اور دیوبند میں بھی اس خاص علاقہ ہی کا انتخاب دارالعلوم کے لئے کیوں کیا گیا؟ اس سوال کے جواب کی بہت سی منزلیں صرف اسی مسئلہ سے طے ہو سکتی ہیں، اور اب اس قصہ کو اسی نقطہ پر ختم کر کے جو سوال اٹھایا گیا تھا، یعنی ایک طرف حضرت حکیم الامت جیسے بزرگوں کی یہ شہادت کہ "پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق اور شفقت سے نہیں پڑھا تھا۔" اور دوسری طرف پڑھنے ہی کے زمانہ میں اپنے ظریف و شفیق استاد کی بارگاہ سے "علم کی بکری" کا ظریفانہ خطاب جو آپ کو عطا ہوا تھا، بظاہر

[1] شفاہاً مختلف حضرات سے خاکسار نے یہ بات سنی ہے، مولانا محمد میاں صاحب نے بھی اپنی اسی کتاب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۱۲

"مولوی صاحب (یعنی مولوی محمد قاسم صاحب) سہارنپور سے وطن آئے"۔ صہ ۲۷

جس نانوتہ سے طلب العلم کے لئے باہر نکلے تھے، تقدیر پھر نخلستان کے اسی چھوٹے شہر نانوتہ کی طرف کھینچ کر لے آئی، اور کامل ایک سال تک سہارنپور سے واپس ہونے کے بعد نانوتہ ہی میں مسلسل آپ کا قیام رہا۔

واپسی کے بعد نانوتہ میں ایک سال کی مدت میں آپ کیا کرتے رہے، مصنف امام یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اپنے متعلق تو ارقام فرمایا ہے کہ ان کے والد مولانا مملوک العلی صاحب دہلی کالج سے بہ بازیافت نصف تنخواہ ایک سال کی رخصت حاصل کر کے حج کیلئے روانہ ہوگئے۔[۱] اسی

[۱] مصنف امام نے حاشیہ پر لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے دونوں چشم و چراغ یعنی مولانا شاہ محمد اسحاق اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا یعقوب جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے اور ولی اللہی درسگاہ میں شاہ صاحب کے جانشین تھے، دونوں حضرات کے دل میں ہندوستان سے ہجرت کا خیال اچانک ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوا، اور خیال میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ ہندوستان کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر دونوں حضرات حجاز تشریف لے گئے، مصنف امام کا بیان ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ مسلمانان ہند کا ایک بڑا قافلہ بھی عرب روانہ ہوا۔ اسی حال نے ان کے والد مولانا مملوک العلی صاحب کے قلب میں بھی کچھ جذبات پیدا کئے، مگر وہ دہلی کالج میں سرکاری ملازم تھے، ساتھ تو ان دونوں حضرات کا نہ دے سکے مگر کوشش کر کے سفر حج کی رخصت حاصل کی، ان کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصت کی منظوری میں کچھ دشواریاں پیش آئیں، مگر بعد کو رخصت بھی منظور ہوئی اور اس رعایت کے ساتھ منظور ہوئی کہ سال بھر کی نصف تنخواہ بھی دی جائے، بادبانی جہاز سے مولانا مملوک العلی روانہ ہوئے۔ تقریباً چار مہینے میں حجاز پہنچے، شاید چار ہی مہینے واپسی کی نذر ہوئے، حرمین میں قیام اور حج و زیارت کے مشاغل سے فارغ ہونے میں چار مہینے لگے، یوں پورے ایک سال میں یہ سفر پورا ہوا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سال بھر کی اس مدت کو سفر حج کا مختصر ترین زمانہ سمجھا گیا تھا لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اتنا طویل سفر اتنی مختصر مدت میں کیسے پورا ہوا، چونکہ سال ہی بھر کی چھٹی تھی، دلی جس وقت مولانا مملوک العلی پہنچے رخصت کی مدت ختم ہو چکی تھی، مجبوراً بجائے وطن کے دہلی کالج میں حاضر ہو کر کام میں مشغول ہو گئے، تقریباً چار مہینے کے بعد ذی الحجہ کے مہینے میں موسمی تعطیل جب ملی تب وطن پہنچ کر گھر کے لوگوں سے ملے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کی چھٹی غالباً دہلی کالج میں نہیں ہوتی تھی اور موسمی تعطیل کا رواج تھا، یہاں سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ شاہ اسحاق و شاہ یعقوب مولانا مملوک العلی کو اساتذہ و شیوخ نے ہجرت کی ان کے ساتھ اور بھی لوگ گئے مگر حجاز پہنچنے کے بعد مولانا مملوک العلی کو ہندوستان واپس لوٹنے اور انگریزی حکومت کی ملازمت میں مشغول رہنے کی جو اجازت ملی اس کا مطلب کیا ہوا، ہجرت کو فرض قرار دینے والے بزرگوں کو اسلاف کے طرز عمل پر غور کرنا چاہئے، والقصہ بطولہا ۱۲

جن گھرانوں میں امتیاز و معاش کا دار و مدار تعلیم ہی پر ہو، ان کے لئے تدریسی ترقیات سے محرومی کی یہ حالت بڑی صبر آزما اور خاندان کے بزرگوں کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے، دوسری راہوں سے بچے کچھ بھی سیکھ رہے ہوں، لیکن جن کتابوں کے پڑھنے اور ختم کرنے کے ساتھ امتیاز اور معاشی راہ کی کشائش وابستہ ہو، جن بچوں کو کسی وجہ سے ان کے پڑھنے اور ختم کرنے کا موقعہ نہیں ملتا، تو سمجھا جاتا ہے کہ ان کا وقت بے کاری میں گذر رہا ہے، مولانا مرحوم کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال معلوم ہوتا ہے کہ پیش آگئی تھی،

نانوتہ کے لئے تعلیمی راہ کا دروازہ مولٰنا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا، دو دلی میں مقیم تھے، اور دلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ دلی کالج کے استاذ تھے، نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی، وہاں تک کے بچے مولٰنا مملوک العلی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے۔[۱]

مگر غیر مستفید ہو رہے تھے، تو مولٰنا محمد قاسم جو علاوہ ہم وطن ہونے کے مولٰنا مملوک العلی سے عزیزداری اور رشتہ داری کے گوناگوں تعلقات رکھتے تھے، ان کے استفادے کا سلسلہ تو ہر لحاظ سے آسان تھا، خصوصاً مولٰنا نانوتوی کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم تو اس تعلیمی وفد کے رکن بھی تھے جو نانوتہ سے دلی روانہ ہوا تھا، اگرچہ اس وفد کے ارکان میں غیر معمولی کامیابی مولانا مملوک العلی کو ہوئی اور بے چارے شیخ اسد علی صاحب صرف فارسی ادب کی تکمیل کر کے وطن واپس ہو گئے

[۱] یہ ایک بڑا تفصیل طلب مضمون ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ نانوتہ میں مظاہر العلوم کے مدرس اول مولانا مظہر نانوتوی یا جیسا ... وغیرہ جیسی مشہور کتابوں کے مترجم مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی یا دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی حضرت شیخ الہند کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰن مولانا شبیر احمد کے والد ماجد، اور اسی قسم کے بیسیوں بزرگوں کو ہم اس زمانہ میں جو پاتے ہیں اگر علم و فضل کے ساتھ مشہور رہیں۔ ان میں بعض حضرات انگریزی حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیمات کے انسپکٹر بھی تھے ... شیخ الہند کے والد ماجد اور مولانا شبیر احمد صاحب کے والد ماجد دونوں حضرات کا جو حال ہے، جہاں تک میرا خیال ہے اس علاقہ کی اس جدید علمی روشنی میں بہت زیادہ دخل مولانا مملوک العلی ہی کے وجود باجود کو ہے، دلی پہنچنے اور وہاں کی تعلیم سے مستفید ہونے کا موقعہ ان لوگوں کو بظاہر مولٰنا مملوک صاحب ہی کی وجہ سے میسر آیا۔

تو اسی پر قیاس کر کے ہجرت کی مخفی نیت اگر ان کی طرف منسوب کی گئی ہو، تو یقیناً یہ بے بنیاد بات نہ تھی۔

بہر حال سہارنپور میں وبائی بخار سے مولٰنا نانوتوی کے نانا کی وفات کا جو حادثہ پیش آیا اسکی وجہ سے سہارنپور میں قیام کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی، مجبوراً نانوتہ واپس ہونا پڑا، اسی زمانہ میں مولٰنا مملوک العلی کا بھی ایک طویل سفر پر روانہ ہو جانا، جس سے واپسی کی توقع بھی مشتبہ تھی، یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت نانوتوی کی تعلیمی زندگی کا شاید یہ سب سے زیادہ نازک زمانہ تھا۔

خدا خدا کر کے یہ سال پورا ہوا، اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانہ میں لوگوں نے اچنبھے کے ساتھ یہ خبر سنی کہ مولانا مملوک العلی صاحب کل ایک سال کے اندر اندر حج و زیارت سے فارغ ہو کر دہلی تشریف لے آئے، چونکہ رخصت مولٰنا مملوک العلی صاحب کی ختم ہو چکی تھی اس لئے واپسی کے ساتھ ہی سرکاری فرائض یعنی دلی کالج کے کاموں میں مشغول ہو گئے، اور اپنے وطن نانوتہ آنے کا موقعہ آپ کو نہ مل سکا۔

ہمارے مصنف امام یعنی مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ ان کے والد مولانا مملوک العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ رجب ۱۲۵۸ھ میں دلی سے بہ نیت حج روانہ ہوئے تھے، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذیقعدہ گویا پانچ مہینے تو راستے میں صرف ہوئے اور پہلی ذی الحجہ کو وہ مکہ معظمہ پہنچے، مناسک حج سے فارغ ہو کر مدینہ آئے، اور یوں

"حرمین کی زیارت سے فارغ ہو کر برس دن میں پھر دہلی پہنچے"۔ ص۲

جس کا مطلب یہی ہوا کہ رجب ہی کے مہینہ میں دلی پہنچے ہوں، واپسی کے بعد مولٰنا مملوک العلی نے رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذیقعدہ، کے مہینے دلی ہی میں بسر کئے، ذی الحجہ میں سالانہ تعطیل کالج میں ہوئی، تب وطن والوں سے ملنے کے لئے آپ نانوتہ تشریف لائے ۱۲۵۹ھ کا گویا یہ آخری مہینہ تھا، حضرت مولانا نانوتوی جن کی ولادت ۱۲۴۸ھ میں ہوئی

اور نورافشانی کا تعلق وابستہ تھا، یعنی دارالعلوم دیوبند بھی۔ اسی محرم کے مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو قائم ہوا۔

بہرحال حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجری سنہ ۱۲۶۰ھ کے ماہ محرم کی ۲ر ۱۸۴۴ء کی ۲۲ر جنوری کے مطابق تھی، گویا ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہند سے تیرہ سال بیشتر مولانا نانوتوی شہر دہلی میں داخل ہوئے، نام نہاد مغل بادشاہ بہادر شاہ ابھی لال قلعہ ہی میں براجے رہے تھے، انکی تخت نشینی پر سات سال گذرے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا نظام مشہور گورنر جنرل لارڈ الن برا کے قبضۂ اقتدار میں تھا، کمپنی کہئے یا انگریزی علاقے میں سندھ کا اضافہ ان ہی کے زمانہ میں ہوا، اور ہندوستان کی جاندار مرہٹہ حکومت یعنی سندھیا کی ریاست گوالیار کے قابض روح یہی لارڈ الن برا صاحب ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ مولٰنا نانوتوی کے سارے تحریری ذخیرے میں صرف یہی ایک انگریز لارڈ الن برا کا نام ایک بیان میں بطور مثال کے ملتا ہے، حالانکہ علاوہ عام انگریزوں کے متعدد گورنر جنرلوں کا زمانہ آپ نے پایا ہے، دلی پہنچکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوعمری کے ان دنوں میں لارڈ الن برا کے نام کو آپ نے تمام ناموں سے اونچا پایا۔ اور غیر شعوری طور پر اس کا ارتسام ذہن پر باقی رہا، جس میں کچھ مدد اس واقعہ سے بھی شاید ملی ہو جو چند ہی مہینے بعد پیش آیا، یعنی مولٰنا نانوتوی جنوری میں دلی تشریف لائے اور جولائی میں یہ خبر ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک مشہور ہوگئی، کہ لارڈ الن برا معتوب و مغضوب بن کر ہندوستان سے بلالئے گئے، ۲۳ر جولائی ۱۸۴۴ء میں بجائے ان کے لارڈ ہارڈنگ اب ہندوستان کے سیاہ سپید کے مالک یعنی گورنر جنرل بنادیئے گئے، خود دلی کے انگریز حاکم بنام رزیڈنٹ اس زمانے میں بے چارے مرزا غالب کے مشہور ممدوح مٹکاف صاحب تھے، جو کشمیری دروازے کی طرف لب سڑک ایک عظیم الشان شاہانہ کوٹھی میں داد عیش و عشرت دے رہے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آج جن لوگوں کا تذکرہ حضرت نانوتوی کے ہم چشموں کے سلسلے میں

خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے، یایوں کہئے کہ علیگڈھ کی جس سیاسی تحریک کا مدمقابل دیوبندیت کے سیاسی نقطۂ نظر کو، اور دلی کی مذہبی تحریک (غیر مقلدیت) کا مدمقابل دیوبندیت کے مذہبی نقطۂ نظر کو سمجھا جاتا ہے، تحریک دیوبند کے ان دونوں ممتاز نشانے کے بانی یعنی ڈاکٹر سرسید احمد خاں مرحوم علیگڈھ تحریک والے اور میاں نذیر حسین مرحوم دلّی کی تحریک غیر مقلدیت کے پیش رو اور سپہ سالار، یہ دونوں حضرات دلّی ہی میں اس وقت موجود تھے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا نانوتوی جن کی عمر اس وقت یعنی ۱۲۶۰ھ ہجری مطابق ۱۸۴۴ء میں بارہ ساڑھے بارہ سال سے زیادہ نہ تھی، سید صاحب آج سے سات سال پہلے یعنی ۱۸۳۷ء ہی میں دلّی کے صدر امین کے سررشتہ دار مقرر ہو چکے تھے اور میاں صاحب دہلوی اس زمانہ میں جب مولٰنا نانوتوی نے دلی میں کافیہ شروع کی تھی، دلّی کے عام علمی حلقوں میں باوجود آفاقی ہونیکے کافی امتیاز حاصل کر چکے تھے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ ۱۲۶۳ھ یعنی مولانا نانوتوی کی آمد کے تین سال بعد سید احمد خاں صاحب کی "آثار الصنادید نامی کتاب جو شائع ہوئی تھی، اس میں میاں نذیر حسین صاحب کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا ہے کہ

"مولوی نذیر حسین صاحب بہت صاحب استعداد ہیں، خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقران سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ فن روایت میں آج بے نظیر ہیں۔"

آخر میں لکھا ہے کہ

"باعتبار سن کے جوان، اور باعتبار طبیعت حلیم، اور وضع متین کے پیر۔"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نظریہ عدم تقلید کے امام الائمہ اس وقت جوان تھے، جب دیوبندی تحریک کے بانی ابھی بارہ ساڑھے بارہ سال کی عمر سے متجاوز نہ ہوئے تھے

اگرچہ دودمان ولی اللٰہی کے حقیقی چشم و چراغ حضرت سیدنا شاہ محمد اسحاق اور ان کے برادر صغیر شاہ محمد یعقوب یہ دونوں حضرات جو اپنے نانا شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللّٰہ کے دلی میں

ہوتی تھیں، لیکن مولانا نانوتوی کو شاید اس تین روپے کی ضرورت بھی نہیں ہوئی، مولانا مملوک العلی کا گھران کا گھر تھا وہی ان کا مدرسہ بھی تھا اور وہی اقامت خانہ بھی،

غالباً ان قدرتی سہولتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ ۲ر محرم کو مولانا دلی پہنچے ہیں، کم از کم چار دن میں یہ سفر پورا ہوا ہوگا، سفر بھی ریل میں نہیں، بہلی میں پورا ہوا تھا، مگر صرف ۳ر محرم یعنی ایک دن کے وقفہ کے بعد ٹھیک چوتھی محرم کو مولٰنا مملوک العلی صاحب نے آپ کو سبق شروع کرا دیا، معف امام جو شاید اس سفر میں ساتھ بھی تھے ارقام فرماتے ہیں۔

"دوسری محرم سن ساٹھ کو دہلی پہنچے چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔" ص۲۸

واللہ اعلم ایک دن کا یہ وقفہ جو سبق شروع کرانے میں ہوا، اس کا سبب کیا تھا، سفر کی تکان اور ماندگی کا ازالہ مقصود تھا، یا آغاز کتاب کیلئے عموماً چہار شنبہ کے دن کو علماء نے جو پسند کیا ہے اس دن کے انتظار میں درمیان کے اس ایک دن کو ٹال دیا گیا، سنہ ۱۲۶۰ کے محرم سے پہلے ذی الحجہ کا مہینہ جو گذرا وہ ۳۰ کا تھا یا ۲۹ کا، چونکہ یہی مسئلہ مشتبہ ہوگیا، اس لئے ۲ر محرم کا دن بھی کچھ مشکوک سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ورنہ چہار شنبہ والی توجیہ ہی شاید ترجیح کی زیادہ حقدار تھی۔

دلی میں مولانا نانوتوی کی تعلیم کی نوعیت

"حضرات دیوبند" کے متعلق مختلف حیثیتوں سے متعدد تذکرے اب تک جو شائع ہوئے ہیں ان میں سیدنا الامام الکبیر کی تعلیم جو دلی میں ہوئی اس کے متعلق بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو صاف کرلیا جائے۔

تمہیدی بیان میں آپ سن چکے کہ حضرت مولانا مملوک العلی دلی کے عربک کالج میں سرکاری مدرس تھے، عربک کالج سے مولانا مملوک العلی کا بھی تعلق غالباً باعث غلط فہمی بنا ہوا ہے، انتہا یہ ہے کہ مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) جیسے عالم خبیر کی طرف ارواح ثلاثہ میں یہ بیان منسوب کیا گیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ

"مولانا نانوتوی دہلی میں مولانا مملوک العلی صاحب سے جب تعلیم پاتے تھے تو وہاں کے کالج میں نام مولانا کا داخل تھا" (ص ۱۹۳ ارواح)

اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ لطیفہ وہ ہے، جسے قصص الاکابر کے جامع نے سیدنا حکیم الامت قدس اللہ سرہ کی طرف بایں الفاظ منسوب کیا ہے یعنی یہ فرماتے ہوئے۔

"کہ مولنا مملوک العلی صاحب جو کہ مولنا محمد یعقوب صاحب کے والد اور مولانا رشید احمد و مولانا محمد قاسم صاحب کے استاد ہیں، دہلی میں دار البقار سرکاری مدرسہ تھا، اس میں ملازم تھے"۔ ص ۳۲ الہادی ماہ شعبان ۵۶ھ

گویا ان دونوں ملفوظات کو ملا لینے کے بعد ایک عامی آدمی قدرتاً اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے کہ مولنا محمد قاسم صاحب کا دلی کے سرکاری مدرسہ میں نام داخل تھا، اور اس سرکاری مدرسہ کا نام "دار البقار" تھا، حاصل جس کا یہی ہوا کہ حضرت نانوتوی مدرسہ دار البقار دلی کے تعلیم یافتہ تھے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت حکیم الامت کی طرف "دار البقار" کا لفظ جو منسوب کیا گیا ہے اس میں یا جامع ملفوظات سے کوئی اندراجی غلطی ہوئی ہے یا خود حضرت تھانوی کو عربی کالج اور دار البقار میں اشتباہ واقع ہوا، بہر حال دار البقار سے تو حضرت نانوتوی کو کسی قسم کا تعلیمی تعلق نہ تھا، اتنی بات تو قطعی ہے، باقی عربی کالج میں آپ کے نام کا داخل ہونا جیسا کہ مولنا حبیب الرحمٰن کی طرف منسوب کیا گیا ہے، بہ ظاہر اس سے یہ خیال گذرتا ہے کہ ابتدا ہی سے مولانا مملوک العلی نے حضرت نانوتوی کا نام عربی کالج میں شریک کرا دیا تھا، میرے نزدیک کلیۃً یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے، غلط فہمی کا منشار غالباً ہمارے مصنف امام یعنی مولانا محمد یعقوب صاحب کا شاید یہ بیان ہے جو سوانح قدیم میں پایا جاتا ہے، انھوں نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ

"والد مرحوم (مولنا مملوک العلی) نے مولوی صاحب (مولنا نانوتوی) کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا، اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے معترض نہ ہوجیو میں ان کو پڑھالوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو، اور قواعد حساب

کی مشق کر لو۔" ص۲۸

آگے دوسرا قصہ ہے جس کا ذکر اپنے موقعہ پر کیا جائے گا' اس قصے کے بعد آخر میں مصنف امام ارقام فرماتے ہیں کہ

"جب امتحان کے دن ہوئے مولوی صاحب (مولوی محمد قاسم صاحب) امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔" ص۲۹

اوپر اور نیچے کے ان دونوں اجزاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاکسار اسی نتیجہ تک پہنچا ہے، کہ سرکاری عربی کالج میں مولنا نانوتوی کے نام کی شرکت دلّی کی تعلیمی زندگی کے صرف ایک سال تک محدود ہے' اور یہ ایک سال بھی جس میں آپ کا اسم مبارک کالج کے باضابطہ رجسٹر میں شریک رہا، غالباً اس وقت کا واقعہ ہے جب عام تعلیم سے آپ فارغ ہو چکے تھے' غالباً آئندہ معاشی زندگی کی سہولتوں کا خیال کر کے شفیق استاد نے مشورہ دیا کہ سرکاری سند بھی حاصل کر لو تو مناسب ہے'

علاوہ دوسرے قرائن کے خود مصنف امام نے مدرسہ چھوڑ دینے کے واقعہ کا ذکر کر کے جو یہ لکھا ہے کہ

"پھر مولوی صاحب (مولنا نانوتوی) نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کر لی اور کتابیں عمولی تمام کر چکے تھے۔" ص۲۹

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتوی کی تعلیمی زندگی کے آخری سال کا یہ واقعہ ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو' عربی کالج میں ابتداء سے مولنا نانوتوی کا حصول علم کے لئے شریک ہونا قطعاً صحیح نہیں ہے' سب سے بڑی دلیل اس کی یہ ہی ہے کہ مولنا نانوتوی کو مولنا مملوک العلی صاحب اپنے ساتھ ۱۸۴۴ء مطابق ۱۲۶۰ہجری میں دلّی میں لائے ہیں' اور دلی کالج کی جو رپورٹ مولوی عبد الخالق صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے تیار کی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک اسی سال یعنی ۱۸۴۴ء میں دلّی کے اس عربک کالج کے دونوں شعبوں

"مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا" (ارواح ص۱۱۶)

اور ہمیشہ یہی حال مکالے کے دوسرے رکن کا تھا، حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا گنگوہی نے ایک جگہ قسم کھائی کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے"۔ قصص ص۲۹

(الہادی ربیع الثانی ۵۷ھ)

ذرا "قسم" کے لفظ پر غور کیجئے، اور سوچئے کہ مولانا گنگوہی جیسی فقیہ النفس والفطرت ہستی اسلام کے قانون یمین (قسم)، کو اپنی بے کمالی کی شہادت میں استعمال کرتی ہے، یقیناً یہ کوئی معمولی بات نہیں ہو[1] سکتی۔

خیر یہ قصہ تو بعد کا ہے، بدگمانوں میں بدگمانی کا زہر شاید پھوٹ نہ پڑے، اس لئے ضمناً یہاں بھی اس کا ذکر کر دیا گیا، ورنہ اس وقت تو یہ بیان کر رہا تھا کہ "کتاب کی بکری" کے خطاب سے جسکی علمی زندگی دیوبند کے مہتابی مکتب میں شروع ہوئی تھی، آگے علم ہی کی راہ میں کن انقلابی منزلوں سے اسکو گذرنا پڑا، پہلے کتابیوں، یا کتاب کے کیڑے بن کر طالب العلمی کرنے والے طالب العلموں سے اس کے اندر ترشی پیدا ہوئی، پھر وہ ان کتابوں سے بھی گونہ مایوس ہوا، جن میں خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کی کتابوں سے بھی زیادہ اور بہت زیادہ دینے والے اپنا وقت دے رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج اپنے عہد کے اہل علم و فضل کا وزن بھی اس کے دل سے کچھ نکلا سا چلا جاتا تھا، یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ شاید نکل چکا تھا۔

ایام طلب و تعلیم کی متعلقہ روایتوں میں ہم اس قسم کے قصے جو پاتے ہیں، مثلاً حکیم الامت کا بیان ہے کہ

---

[1] بیرونی آمیزشوں سے پاک رکھتے ہوئے قرآن کا پڑھنے والا اس کتاب کی پہلی آیت الحمد للہ رب العلمین ہی کی روشنی میں وہی پاتا ہے جس کا اعلان مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قسم کھا کر فرما رہے تھے، باقی قرآن کے ساتھ جو اپنی حسی معلومات پر بھی بھروسہ کرتے ہیں ان کے لئے حکیم الامت کی یہ توجیہ تشفی بخش ہو سکتی ہے کہ بر خدا کمال کا قاعدہ ہے کہ جو کمالات ابھی اسے حاصل نہیں ہوئے ہیں انکے مقابلہ میں کمالات حاصلہ کی کوئی قیمت نہیں پاتا جیسے لکھ پتی کے مقابلہ میں چند پیسوں والا اپنے پیسوں کو مال نہیں سمجھتا ۱۲

سے قطب گنگوہی ایک درجہ نیچے تھے۔ لیکن عمران کی اس وقت جب دتی آپ کے قدوم فرمائی سے رونق اندوز ہوئی، صاحب تذکرۃ الرشید کے بیان کے مطابق سترہ سال کی تھی، برعکس اس کے مولٰنا نانوتوی جب دلی پہنچے ہیں اس وقت عمر کے لحاظ سے بارہ تیرہ کے درمیان میں تھے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ

"جب آپ کی (مولٰنا نانوتوی کی) عمر تیرہ برس کی تھی واسطے تحصیل علم ظاہری، کے دہلی تشریف لے گئے" (صفہ ۹ سوانح مخطوطہ)

یوں بھی سن ولادت کے حساب سے دونوں بزرگوں میں چار سال کا تفاوت تھا ہی، قطب گنگوہی کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں، اور حضرت نانوتوی کی ۱۲۴۸ھ میں ہوئی، نیز صاحب تذکرۃ الرشید کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قطب گنگوہی جب ہدایۃ النحو پڑھتے ہوئے دتی آئے، تو کچھ دنوں تک پنجاب کے ایک بزرگ قاضی احمد الدین جو جہلم کے رہنے والے تھے، ان ہی سے پڑھتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے دونوں بزرگوں کی نصابی کتابوں میں تفاوت کا جو قصہ تھا، یہ قصہ غالباً مولوی احمد الدین صاحب ہی کے حلقہ درس میں ختم ہو گیا، عمر بھی حضرت قطب گنگوہی کی کافی تھی، آگے بڑھ جانے میں دشواری نہ ہوئی، اور گو ہمارے پاس کوئی بیّن صریح شہادت تو نہیں ہے لیکن مذکورہ بالا معلومات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قطب گنگوہی نے جس وقت مولانا مملوک العلی ہی کے پاس پڑھنے کا آخری فیصلہ فرما لیا، اور مولٰنا مملوک العلی نے پڑھانا منظور فرما لیا تو بقول صاحب تذکرۃ الرشید

"قابل استاد کا قاعدہ ہے کہ ذکی طالب العلم کو ڈھونڈھتا ہے اور سمجھ دار طالب العلم کا دستور ہے کہ قابل استاد کی ٹوہ لگاتا ہے۔ اس لئے ہر دو جانب سے دلی راحت کے سامان پیدا ہو گئے"

اسی کے بعد ان کے الفاظ ہیں کہ

"مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا" (ارواح صفحہ ۲۱۶)

اور ہمیشہ یہی حال مکالمے کے دوسرے رکن کا تھا، حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولانا گنگوہی نے ایک جگہ قسم کھائی کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے" قصص صفحہ ۲۹

(الہادی ربیع الثانی ۵۵ھ)

ذرا "قسم" کے لفظ پر غور کیجئے، اور سوچئے کہ مولانا گنگوہی جیسی نقیۃ النفس والفطرت ہستی اسلام کے قانون یمین (قسم) کو اپنی بے کمالی کی شہادت میں استعمال کرتی ہے، یقیناً یہ کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔[1]

خیر یہ قصہ تو بعد کا ہے، بدگمانوں میں بدگمانی کا زہر شاید پھوٹ نہ پڑے، اس لئے ضمناً یہاں بھی اس کا ذکر کر دیا گیا، ورنہ اس وقت تو یہ بیان کر رہا تھا کہ "کتاب کی بکری" کے خطاب سے جسکی علمی زندگی دیوبند کے مہتابی مکتب میں شروع ہوئی تھی، آگے علم ہی کی راہ میں کن انقلابی منزلوں سے اسکو گذرنا پڑا، پہلے کتابوں، یا کتاب کے کیڑے بن کر طالب العلمی کرنے والے طالب العلموں سے اس کے اندر ترشی پیدا ہوئی، پھر وہ ان کتابوں سے بھی گونہ مایوس ہوا، جن میں خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کی کتابوں سے بھی زیادہ اور بہت زیادہ دینے والے اپنا وقت دے رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج اپنے عہد کے اہل علم وفضل کا وزن بھی اس کے دل سے کچھ نکلا سا چلا جاتا تھا، یا کہے تو کہہ سکتے ہیں کہ شاید نکل چکا تھا۔

ایام طلب وتعلیم کی متعلقہ روایتوں میں ہم اس قسم کے قصے جو پاتے ہیں، مثلاً حکیم الامت کا بیان ہے کہ

---

[1] بیرونی آمیزشوں سے پاک رکھتے ہوئے قرآن کا پڑھنے والا اس کتاب کی پہلی آیت الحمد للہ رب العلمین ہی کی روشنی میں وہی پاتا ہے جس کا اعلان مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قسم کھا کر فرما رہے تھے، باقی قرآن کے ساتھ جو اپنی حسی معلومات پر بھی بھروسہ کرتے ہیں ان کے لئے حکیم الامت کی یہ توجیہ تشفی بخش ہو سکتی ہے کہ بہر حال کمال کا قاعدہ ہے کہ جو کمالات ابھی اسے حاصل نہیں ہوئے ہیں انکے مقابلہ میں کمالات حاصلہ کی کوئی قیمت نہیں پاتا جیسے لکھ پتی کے مقابلہ میں چند پیسوں والا اپنے پیسوں کو مال نہیں سمجھتا ۱۲

"مولانا محمد قاسم صاحب فرماتے تھے کہ حدیث پڑھنے کے وقت میں یہی سوچا کرتا تھا کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمائی"۔

(قصص ص۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ)

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جب آپ حدیث پڑھنے لگے، تو عام طور پر حدیث کے شروح و حواشی میں جن باتوں سے بحث کی جاتی ہے، بجائے ان کے اسلامی احکام و قوانین کی روح اور بنیاد کے دریافت کا نیا شوق اور ولولہ آپ میں پیدا ہو گیا تھا، جس میں نہ ان کو ان کتابوں سے مدد مل سکتی تھی جن کا عموماً اس زمانے کے مدرسوں میں رواج تھا، اور نہ ان اساتذہ سے اس باب میں وہ چنداں مستفید ہو سکتے تھے جو نہ اس طرزِ فکر کے عادی تھے اور نہ اپنے درس میں دین کے اس پہلو پر اس زمانہ میں کوئی بحث کرتا تھا، اور جو حال آپ کا اللہ کے رسول کی حدیثوں اور حدیث کی کتابوں کے متعلق ہو گیا تھا، کچھ یہی کیفیت خود اللہ کی کتاب کے متعلق بھی ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی، حضرت حکیم الامت ہی اس خبر کے راوی ہیں کہ

"مولانا محمد قاسم فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں ہی غور کرنا چاہئے تو مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے"۔ (قصص ص۳۰ الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۵۰ھ)

ذاتی تجربہ اور پختہ کاری کی یہ ایسی بات ہے جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو شاید نہیں ہو سکتا جو قرآن کے قطعی الدلالۃ قطعی الثبوت نصوص اور آیتوں کے حکم و اسرار کو ان تخمینی اور ظنی احتمالات کی روشنی میں سمجھنے یا سمجھانے کے عادی ہیں، جن کا ذکر تفسیر کی عام کتابوں میں کیا جاتا ہے، غیر مشکوک کے ساتھ جب مشکوک مقدمات کے معانی کو بھی ملا دیا جائے تو خود سوچئے کہ غیر مشکوک غیر مشکوک کب رہ جاتا ہے؟

بہرحال میرے نزدیک سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا بیان کا مآل اور حاصل بھی یہی ہے کہ اللہ کے رسول کی حدیثوں کے اسرار و حکم سمجھنے میں عام طور پر شروح و حواشی سے مستغنی ہو گئے تھے، کچھ یہی حال ان پر خود اللہ کی کتاب کے متعلق بھی طاری ہو گیا تھا، وہ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان

اسرار و حکم قرآن کے سمجھنے کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ ان علوم قرآن کا سب سے آسان طریقہ آپ کے نزدیک یہی تھا کہ بجائے دوسروں کے، براہ راست حق تعالیٰ کے الفاظ ہی میں غور و فکر کیا جائے، اس طریقہ سے ان کا احساس و تجربہ یہ تھا کہ قرآن کا مقصد واضح اور صاف ہو جاتا ہے، ان کے طریقہ فکر کی ان خصوصیتوں پر تفصیلی بحث تو آئندہ آئے گی، اس وقت اجمالاً ان امور کا ذکر جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف اس لئے کیا گیا کہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اپنی تعلیمی زندگی میں وہ جس مقام تک پہنچے اس کا نقشہ ترتیب کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس حد تک میں اپنے کام سے فارغ ہو چکا ہوں، گویا سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی کے متعلق اب تک صرف اسی سوال کا کہ آپ کس طرح پڑھتے رہے اور پڑھنے کے اس زمانہ میں فکر و نظر کی کن ارتقائی منزلوں سے آپ گذرتے رہے جواب دیا گیا ہے، باقی یہ باتیں کہ کن کن علوم و فنون کی کتابیں اس عرصہ میں آپ پڑھتے رہے اور کن کن استادوں سے پڑھتے رہے، اگرچہ ان کے متعلق بھی گذشتہ اوراق میں کچھ نہ کچھ چیزوں کا، خواہ ضمناً ہی، تھوڑا بہت ذکر آتا رہا ہے، اور جہاں تک میرا خیال ہے، طالب العلم خصوصاً ایسے عبقری الفطرت طالب العلم جیسے حضرت والا تھے، اس قسم کے طلبہ کے متعلق جوہری اور اصلی سوال یہی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح پڑھتے رہے، نتیجہ کی نوعیت کلیۃً نہیں تو عموماً اسی طرز عمل کی نوعیت کے تابع ہوتی ہے، کتابوں اور استاذوں کا سوال "طبائع فائقہ" کے لئے میرے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتا، بقول شخصے

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

دراصل یہی وجہ ہوئی کہ زیادہ تر اس سلسلہ میں میری توجہ حضرت والا کی تعلیمی زندگی کے اسی سوال پر مرکوز رہی، لیکن آپ کی سوانح عمری جب لکھی جا رہی ہے تو ضرورت ہے کہ اہمیت ہو یا نہ ہو، مگر ان سوالوں پر بحث کی جائے۔

کتابوں کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ معقولات کے سلسلہ میں صدرا، شمس بازغہ، میرزاہد کا

پہنچکر اس وقت تک پڑھتے رہے، جب تک "ہم سبقی" کا یہ رشتہ مولانا نانوتوی کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا، اس لئے مولوی احمد الدین سے بھی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ پڑھا ہو، اس کا تو احتمال پیدا نہیں ہوتا، لیکن مفتی صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت گنگوہی کا علمی استفادہ جب یقینی ہے، اور جہاں تک قرائن کا اقتضاء ہے، دونوں حضرات کی "ہم سبقی" کے رشتہ کے بعد مفتی صاحب سے مولانا گنگوہی نے استفادہ فرمایا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرے "ہم سبق" نے اس استفادہ سے گریز کی راہ کیوں اختیار کی ہوگی، خصوصاً مفتی صاحب پر منقولیت سے زیادہ معقولیت کا غلبہ تھا، جس میں چاہئے تو یہی کہ مولانا گنگوہی سے زیادہ مولانا نانوتوی کے لئے نسبتاً زیادہ کشش تھی۔

اس قسم کے واقعات مثلاً مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید میں نقل کیا ہے کہ

"غدر کے بعد حضرت (مولانا گنگوہی) کو دہلی تشریف لانے کا اتفاق ہوا، تو مفتی صدر الدین صاحب سے ملنے تشریف لے گئے، مفتی صاحب نہایت ہی شفقت و محبت سے ملے اور سب حالات پوچھنے لگے۔"

ان ہی حالات میں سب سے اہم حال جسے مفتی صاحب اس وقت دریافت فرما رہے تھے، یہ تھا

"میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟"

حضرت گنگوہی نے جواب میں اطلاع دی کہ

"مطبع میں تصحیح کرتے ہیں آٹھ یا دس روپے تنخواہ ہے"

لکھا ہے کہ اس عجیب و غریب خبر کو سن کر مفتی صاحب سناٹے میں آگئے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"ہاتھ پر ہاتھ مار کر فرمانے لگے، قاسم ایسا ستا قاسم ایسا ستا"

اور آخر میں فرمانے لگے، کہ

"فقیر ہو گئے فقیر ہو گئے" ص۳۲ تذکرۃ الرشید

میں کتنی تھی، واقعہ یہ ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کسی وجہ سے ابوداؤد کے پڑھنے کا موقعہ مولٹنا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو نہ مل سکا تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ صحاح کی چھ کتابوں میں سے پانچ کتابیں جو پڑھ چکا ہو، حدیثوں کے مکرر ہونے کی وجہ سے صرف ایک کتاب کا مسئلہ عام طلبہ کے لئے بھی چنداں اہمیت اپنے اندر نہیں رکھتا، پھر جس فطرت فائقہ سے مولانا سرفراز تھے ان کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مطالب و معانی کے سمجھنے کے لئے مولانا احمد علی صاحب سے تلمذ کا تعلق آپ نے پیدا کیا تھا، اب میں کیا کہوں، وہی بے جا خوش اعتقادی کی تہمت سے پھر ڈرتا ہوں، مگر لوگوں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے، انہیں کہاں تک چھپاؤں، اکابر دیوبند کے حالات کی متداول و مشہور کتابوں میں آپ کو یہ روایت ملیگی کہ جن دنوں سیدنا الامام الکبیر دلی میں پڑھ رہے تھے، جامع مسجد کے پاس دار البقاء مدرسہ کی جو عمارت تھی اس میں ایک مجذوب حافظ عبدالقادر نامی رہتے تھے، مولٹنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے بعض مکاشفات کا جن کا مولانا نے خود مشاہدہ فرمایا تھا ذکر کیا کرتے تھے، خصوصاً غدر کی عام خوں ریزی سے مہینہ سوا مہینہ پہلے مولٹنا گنگوہی فرماتے تھے کہ میں حافظ عبدالقادر کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، کہ اچانک پیچھے مڑے اور مڑ کر مجھ سے پوچھے لگے کہ کون ہے قدرت اللہ ہے؟

مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حضرت "رشید احمد" ہے، اسکے بعد مولٹنا گنگوہی کا بیان ہے کہ حافظ صاحب الٹے پاؤں پیچھے ہٹے اور کہتے جاتے تھے کہ ہٹوہ، ہٹوہ، پھر اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے بولنے لگے کہ

"یہ میرے گولی لگی، یہ میرے گولی لگی"

اور یہی کہتے ہوئے بھاگ گئے، مولانا فرماتے تھے کہ اسی کے مہینہ سوا مہینہ بعد غدر کا ہنگامہ شروع ہوا، اور حافظ عبدالقادر مجذوب بے چارے کو گولی لگی، اسی سے شہید ہو گئے، یہ بھی فرماتے تھے کہ "گولی سینہ ہی میں لگی" (ارواح ص ۳۱۵)

جس سے معلوم ہوا کہ حافظ عبدالقادر شہید کے جذب صحیح کے "معترف مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ

علیہ بھی تھے، اب سنئے قصہ ان ہی مجذوب حافظ صاحب کا ارواح ثلثہ میں اجزار کی کمی و بیشی کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر دو جگہ پر کیا گیا ہے، ایک میں حضرت مولانا گنگوہی کے حوالہ سے قصہ درج ہے اور دوسری جگہ مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم دار العلوم دیو بند کی زبانی روایت نقل کی گئی ہے، دونوں روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ ایام طالب العلمی میں ایک دن مولٰنا محمد قاسم دلی کے کسی کوچہ سے گذر رہے تھے کہ ان ہی حافظ عبد القادر مجذوب سے راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی، مولٰنا کے ہاتھ میں اس وقت بخاری شریف کا نسخہ تھا، (غالباً بخاری اس زمانہ میں پڑھ رہے تھے) حافظ صاحب نے بخاری کا یہ نسخہ آپ سے چھین لیا اور لے کر آگے بڑھ گئے، مولانا اس خیال سے کہ خدا جانے کتاب کو کہاں ڈالدیں گے، آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے، راستہ میں بھڑ بھونجہ کی ایک دوکان ملی، حافظ صاحب اسی دکان پر چڑھ گئے اور بھڑ بھونجہ کی بھٹی پر بیٹھ کر بخاری شریف کی ورق گردانی شروع کر دی، اوراق کو الٹتے جاتے تھے اور زبان سے مِن مِن مِن مِن کہتے جاتے تھے،

مولٰنا حبیب الرحمن مرحوم کی روایت میں ہے کہ مجذوب صاحب نے پوچھا تھا کہ یہ کون سی کتاب تیرے ہاتھ میں ہے، جواب دیا گیا بخاری شریف، تب لیکر وہ حرکتیں شروع کیں، بہر حال مولٰنا کھڑے کھڑے ان کی حرکتوں کو دیکھتے رہے، آخر میں حافظ صاحب نے کتاب بند کی، اور واپس کرتے ہوئے مولٰنا کو خطاب کر کے فرمایا۔

"جا تو بڑا عالم ہے"

ممکن ہے کہ مستقبل کی پیشگوئی حافظ صاحب کے اس کشفی بیان کو قرار دیا جائے، لیکن میرا ذاتی احساس یہی ہے کہ حضرت والا کی "علمی عبقریت" قوت سے فعل کے رنگ میں جو آچکی تھی، یہ اسی واقعہ کی تعبیر ہے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے خود سیدنا الامام الکبیر "معلومات" اور "علم" ان دونوں کے فرق کو ان الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے کہ

"کسی کے مبصرات (یعنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کا ذخیرہ) زیادہ ہو، اور

سب چیزوں کو دیکھا ہو، مگر ہے وہ چوندھا، اور کسی کا ابصار (دیکھنے کی قوت) زائد ہو، گو اس نے تھوڑی چیزوں کو دیکھا ہو، لیکن خوب حقیقت تک پہنچا ہو۔"

(تصص صنہ۳ الہادی صفر ۵۰ھ)

میرا خیال یہی ہے کہ بخاری پڑھنے کے زمانہ میں مجذوب حافظ صاحب نے "بڑا عالم" ہونے کی خبر جو دی تھی، اس سے معلومات کی گرد آوری والا علم مراد نہیں ہے، بلکہ علم کا ملکہ فائقہ آپ کی فطرت میں جو ودیعت تھا، اسی کے ظہور و بروز کی یہ اطلاع ہے۔

ظاہر ہے کہ بخاری شریف کے پڑھنے کے زمانہ میں "بڑے عالم" ہوجانے کی اطلاع کشفی راہ سے جسے مل چکی تھی، اسی کے متعلق اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف اتصال و تصحیح سند کی غرض سے ابوداؤد اس نے پڑھی تھی، تو اس کو بے جا عقیدت مندی ٹھہرانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس روایت کو بھی اگر ملا دیجئے، جس کا ارواح ثلاثہ میں مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ پنجلاسہ (پنجاب) میں ایک بزرگ راؤ عبدالرحمٰن خاں نامی تھے، کشفی حالت ان کی بھی غیر معمولی تھی، دروزہ کے لئے تعویذ لینے کے لئے کوئی آتا تو تعویذ کے ساتھ کہہ دیا کرتے تھے کہ لڑکا ہوگا، یا لڑکی بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوجاتا ہے، تو بولے کہ کیا کروں، پیدا ہونے والے بچے کی صورت سامنے آجاتی ہے، بہر حال اکابر دیوبند خصوصاً شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ سے ان کے بڑے تعلقات تھے، خود سیدنا الامام الکبیر ان سے ملنے کے لئے پنجلاسہ جایا کرتے تھے، پہلے حج کے سفر کے موقعہ پر بھی حاضر ہوئے اور راؤ صاحب سے مولٰنا نے عرض کیا کہ میرے لئے دعا فرمائیے، یہ سن کر راؤ صاحب نے فرمایا کہ:

"بھائی تمہارے لئے کیا دعا کروں، میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دونوں جہان کے بادشاہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے بخاری شریف پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔" (صنہ۱۹۳ ارواح)

کیا اس کے بعد بھی یہی سمجھا جائے کہ مطلب فہمی کے لئے ان کو استاذ کی ضرورت باقی تھی!
بلکہ اسی کے ساتھ آپ ان آثار اور ان علامتوں کو بھی شریک کرلیجئے جو بیعت ہونے کے بعد ذکر وشغل کے سلسلہ میں ابتدائی مشغولیت کے وقت آپ کے سامنے پیش آئے تھے جن کا تذکرہ علاوہ دوسروں کے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بھی یہ کہتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ

"اس زمانہ میں مولٰنا (محمد قاسم رح) محض نو آموز طالب العلم تھے"

یہاں یہ کہا جاتا ہے جیسا کہ حکیم الامت تھانوی نے بھی ذکر کیا ہے کہ "بیعت اور ذکر وشغل کی تعلیم کے بعد قاعدہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگ ان حالات کا تذکرہ کرتے جو ذکر وشغل کے وقت ان کے سامنے پیش آتے تھے، مگر خلاف دستور مولانا محمد قاسم نے اپنے کسی حال کا ذکر حاجی صاحب سے نہیں کیا، آخر ایک دن خود ہی دریافت فرمایا کہ "آپ کچھ نہیں کہتے" اپنے پیر کے اس استفسار پر حضرت تھانوی کا بیان ہے

"مولٰنا (محمد قاسم) رونے لگے"

پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے کہ اپنا حال کیا بیان کروں،

"جہاں تسبیح لے کر بیٹھا، بس ایک مصیبت ہوتی ہے، اس قدر گرانی کہ جیسے سَو سَو من کے پتھر کسی نے رکھدیئے، زبان وقلب سب بستہ ہوجاتے ہیں" (زلزلہ ص ۵۷)

حضرت امیر شاہ خاں صاحب سے فقیر نے سنا تھا کہ زبان معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ ہوگئی، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے،

بہرحال اب یہی سننے کی بات ہے، اپنے جس حال سے سیدنا الامام الکبیر میں حد سے زیادہ مایوسی اپنے متعلق پیدا ہوگئی تھی، راہ ورسم منزل سے جو آگاہ تھا، یعنی آپ کے شیخ عارف نے سن کر حکیم الامت کا بیان ہے

"بے ساختہ فرمانے لگے کہ مبارک ہو"

جانتے ہیں یہ عجیب وغریب کیفیت موجب تبریک وتہنیت کیوں بن گئی، مجھ سے براہ راست

حضرت امیر شاہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"مولنا حق تعالیٰ کے اسم علیم کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے، اور اسی نسبت خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جا رہا ہے۔"

پھر اس دعویٰ کی دلیل میں حضرت حاجی صاحب نے یاد دلایا نزول وحی کی اس کیفیت کو جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوئی تھی، جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ غیر معمولی وزن آپ میں پیدا ہو جاتا، اونٹ کی پشت پر ہوتے تو اونٹ بیٹھ جاتا (سوائے قصوا، آپ کی خصوصی اونٹنی کے) زید بن ثابت کاتب وحی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو وہ واقعہ مشہور ہی ہے کہ ان کے زانو پر سر رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما تھے کہ عین اسی حال میں وحی نازل ہونے لگی، زید کا بیان ہے کہ اتنا غیر معمولی وزن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس وقت پیدا ہو گیا کہ گویا میرا زانو چور چور ہو جائیگا، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، اور یہ قصہ تو بخاری شریف کے شروع ہی میں ہے کہ سردیوں کے سخت ترین موسم میں بھی وحی جب نازل ہوتی، تو جبین انور پسینہ سے شرابور ہو جاتی تھی۔

الغرض شدت وگرانی کی جو کیفیت نزول وحی کے وقت پیدا ہوتی تھی، اسی کیفیت کو پیش کر کے شیخ عارف نے سمجھایا کہ یہ علمی نسبت کا زور ہے، اور جیسا کہ حکیم الامت سے اس موقعہ پر نقل کیا گیا ہے کہ حاجی صاحب نے مولانا محمد قاسم کو خطاب کر کے فرمایا کہ

"یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے، اور یہ وہ ثقل ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا۔"

جس کی تشریح حاجی صاحب ہی کے حوالے سے انھوں نے یہ کی ہے کہ

"تم سے (یعنی مولٰنا محمد قاسم سے) حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو، ذکر وشغل کا اہتمام چھوڑ دو۔"

نبیوں کا جو کام سیدنا الامام الکبیر سے لیا گیا اسے تو دنیا دیکھ رہی ہے، اس وقت میرے سامنے یہ واقعہ نہیں بلکہ فقط یہ بتانا ہے کہ یہ سارے واقعات جن کا ذکر منتشر طور پر لوگ کرتے ہیں،

ہزار علماء کی روزیاں، بلکہ انصاف سے اگر کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کروڑہا کروڑ مسلمانوں کی دینی خبر وزیاں مستور تھیں۔

بہرحال مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے سات سال پہلے ۱۸۵۰ء سے حضرت والا پر اپنے رفقاء درس، اور ہم درس ساتھیوں کے برخلاف یہ عجیب وغریب حال طاری ہوا، اس وقت حساب سے آپ کی عمر بمشکل (۱۹) سال ہو گی، پوری بیس بہاریں بھی ابھی اس پر نہ گذری تھیں عین شباب کا عالم تھا، جیسے آپ ہی کے دوسرے ہم استاذوں کے سامنے "ثروت واقتدار" کا وسیع صحرا پھیلا ہوا تھا، یقیناً اس وسیع میدان میں اپنے گھوڑے کو اگر وہ کدانا چاہتے تو اس سے آپ کو کوئی روک نہیں سکتا تھا، بلکہ جن خداداد ملکات، اور فطری کمالات سے سرفراز تھے، ان کو دیکھتے ہوئے یہ بے جا توقع نہ تھی کہ ساتھیوں سے آپ ہی کے عزم اور ارادے کا گھوڑا آگے بڑھ جاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے پہلے استاذ مرحوم نے سرکاری امتحان میں شریک ہونے کا مشورہ جو آپ کو دیا تھا، شاید اس مشورے کی بنیاد اسی پر قائم ہو کہ اس میدان میں اترنے والوں کیلئے "سرکاری سند" اجازت نامہ کی حیثیت رکھتی تھی، مگر عرض کر چکا ہوں کہ باوجود تیار ہونے کے عین وقت پر امتحان کی شرکت کا ارادہ آپ نے فسخ فرما دیا۔ اسی زمانہ میں استاذ مرحوم کی وفات بھی ہو گئی، شاید ان ہی کا کچھ خیال حضرت والا کے فطری میلانات کے ابھار اور ظہور میں بظاہر مانع تھا، ان کی وفات کے بعد یہ دباؤ بھی اٹھ گیا، اچانک اسی کے بعد چیلیوں کے کوچے کے اس مکان میں آپ کو کوٹھے پر پڑے ہوئے جھلنگے پر ہم پاتے ہیں، جہاں کئی کئی دن کی پکی ہوئی روٹیوں کے خشک روکھے سوکھے ٹکڑوں کے سوا اپنے "نفس" کو آپ کچھ نہیں دیتے۔

ہندوستان کا مشہور سیاسی ہنگامہ جس کا مشہور نام غدر ہے، اس سے چند سال پیشتر سیدنا الامام الکبیر پر اس حال کا طاری ہونا، اور جیسا کہ مشہور ہے کہ ہندوستان کے اس سیاسی بھونچال میں حضرت والا کی عملی شرکت بھی ثابت ہے، جس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا، نیز آپ کے کچھ بعد بھی بلکہ زندگی میں بھی اس قسم کی باتیں آپ کی طرف منسوب کرنے والے جو عموماً منسوب کیا کرتے تھے

مثلاً امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلٰثہ میں نقل کیا گیا ہے کہ رامپور منہاران ضلع سہارنپور جہاں مولانا محمد طیب کی سسرال ہے، وہاں کے بعض باشندوں نے مولانا نانوتوی کی زندگی ہی میں

"حکومت میں یہ درخواست پیش کی کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں کھولا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کئے جائیں تاکہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہو جائے، یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبہ کو قواعد جنگ کی بھی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کرانے کے لئے کابل کو تیار کر رہا ہے۔" ص۱۶۸

یہ اور اسی قسم کی دوسری معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ سوچا جائے کہ ہندوستان جن روح فرسا جاں گسل حالات سے اس وقت گذر رہا تھا، علی الخصوص مسلمانوں پر اس ملک میں جو تاریکی افتاد پڑی تھی، شاید ہی کوئی دن طلوع ہوتا ہو گا، جس میں برصغیر کا کوئی علاقہ یا کوئی صوبہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں سلسلہ نہ چلا جا رہا تھا، آج سلطان شہید ٹیپو شہید ہوئے، کل سراج الدولہ والی بنگال و بہار مارا گیا، اور جنوبی ہند میں ارکاٹ کے نوابوں کی نوابی ختم ہو رہی ہے تو شمالی ہند میں اودھ کی سرکار کے الحاق کا اعلان ہو رہا ہے، جو تخت پر تھے وہ پھانسی کے تختوں پر چڑھائے جا رہے تھے، کاخ سے خاک پر گرنے کا نہ ٹوٹنے والا حادثہ تھا، جو گھر گھر میں برپا تھا، لال قلعہ تک محدود نام نہاد مغلی حکومت کے متعلق اگرچہ ۱۸۲۶ء میں لارڈ امہرسٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ

"ہماری گورنمنٹ اب کچھ تیموریہ خاندان کی تابع نہیں ہے بلکہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے۔"[1]

لیکن اس زبانی اعلان نے ابھی کاغذی لباس اختیار نہیں کیا تھا، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک ۱۸۵۰ء جس میں ہمارے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کو اس عجیب و غریب حال میں پایا تھا، اسی ۱۸۵۰ء میں لارڈ ڈلہوزی نے کمیٹی قائم کر کے لال قلعہ والی مغلی حکومت کے متعلق یہ طے کرتے ہوئے کہ

"بادشاہ (بہادر شاہ مرحوم) کی وفات کے بعد مرزا فخرو برائے نام بادشاہ ہیں۔"

لال قلعہ سے بھی تیمور کی اولاد کا رشتہ ہمیشہ کیلئے اس فیصلہ کے ذریعہ منقطع کر دیا گیا کہ مرزا فخرو برائے نام

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند مصنفہ سرسید احمد خاں ص۱۸ ضمیمہ حیات جاوید

سر سید نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں، آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چھٹی آئی، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے"۔

آخر میں وہی لکھتے ہیں کہ

"یہاں تک ہندوستانی اہل کاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی، کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو"۔ صلا

خلاصہ یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی دنیا بھی لٹ رہی تھی اور لٹتی چلی جا رہی تھی، اور دین بھی ان کا اچانک ایسے مہیب نرغے میں گھر گیا تھا، جس کے نتائج کو دیکھ کر بقول سر سید آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا تھا، اور پاؤں تلے کی مٹی نکلی چلی جاتی تھی، ایسی صورت میں ذہن اگر ادھر منتقل ہو کہ چیلوں کوچے والے مکان میں دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بے تعلق ہو کر جھلنگے پر جو پڑا ہوا تھا، وہ ملک و ملت کے ان ہی حالات سے متاثر تھا، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، اس قسم کے قومی حوادث میں یہ واقعہ ہے کہ بڑی مصیبت ان ہی لوگوں کے لئے ہوتی ہے، جن کے سینے میں حساس و نازک دل بھی ہو، اور اس حساس و نازک دل کے ساتھ دماغ بھی ان کے سامنے دلی بےچینیوں کے ازالہ کیلئے طرح طرح کے مشوروں اور تجویزوں کے پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

ہمارے مصنف امام نے ان ہی ایام کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقعہ پر جو یہ خبر دی ہے کہ

"جس زمانہ میں مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) میرے مکان میں رہتے تھے، مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی"۔ صلا

"جذب کی حالت" سے حضرت والا کے جس حال کی تعبیر وہ کر رہے ہیں، آگے اس کی تشریح جن الفاظ میں کی گئی ہے بیساختہ اس کو دیکھ کر دماغ میں مشہور عثمانی شعر

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی

تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

چکر کھانے لگا، بلکہ سچ پوچھئے تو سر چکرانے لگا، تباہ ہم ہو رہے تھے، ہم مٹ رہے تھے، یا مٹائے جا رہے تھے، اور سنئے، مصنف امام کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ آج جنہیں ہم سیدنا الامام الکبیر کے نام سے موسوم کر رہے تھے ان ہی پر یہ حال طاری تھا کہ

"بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترے، نہ درست کئے" ۔ صہ ۳

آخر میں فرماتے ہیں،

"عجیب صورت تھی" ۔ صہ ۳

آگے اسی کے بعد وہی راوی ہیں کہ

"جوئیں بھی بہت ہو گئی تھیں" صہ ۳

اور اسی کے ساتھ یہ اطلاع بھی اسی زمانے کے متعلق وہ دیتے ہیں کہ

"باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو، اور مغموم جیسی صورت رہتے" ۔ صہ ۳

میں کیا مصنف امام کی ان چشم دید شہادتوں کو جو بھی پڑھے گا، اور اس کے ساتھ پھر سوچے گا کہ امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ اس سراغ رسانی سے حکومت بھی کافی متاثر ہوئی، ان کی روایت کے الفاظ ہیں کہ

"حکومت کے یہاں سے تفتیش حالات کے لئے احکام جاری ہوئے، اور تفتیش کے مراکز گنگوہ، نانوتہ، رامپور جلال آباد قرار پائے، اور ان کا صدر مقام دیوبند بنایا گیا، حکام نے دورے کئے" ۔ صہ ۱۴۱

یہ بھی ان کا بیان ہے کہ حکومت قائمہ کا کوئی افسر نانوتہ پہنچ کر حضرت سے براہ راست ملا بھی، حضرت والا اس وقت مسجد میں تھے، حاکم نے کہلا بھیجا کہ آپ سے ملنے کے لئے میں کیا مسجد میں

داخل ہو سکتا ہوں، لکھا ہے کہ مولانا مرحوم نے آنے کی اجازت دیتے ہوئے صرف یہ فرمایا کہ "اگر اندر آنا چاہتے ہیں تو جوتے اتار کر آئیں" بہرحال وہ آیا اور جوتے اتار کر آیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ملنے کے ساتھ ہی وہ حضرت والا کی شکل و صورت ہی سے اتنا مرعوب اور غیر معمولی طور پر متاثر ہوا کہ سامنے بیٹھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی، کھڑے کھڑے ادب کے ساتھ کچھ باتیں دریافت کیں اور چلا گیا اور جا کر اس نے رپورٹ کردی کہ اس قسم کی ہستیوں پر غدر و فساد کا الزام لگانے والے خود مفسد ہیں، اور جو سراغ رسانی کی گئی ہے، صرف شرارت پر اس کی بنیاد قائم ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس افسر نے اسی قسم کی رپورٹ کی ہو، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت والا کی کارروائیوں کو "غدر و فساد" سے تعبیر کرنا، خود غداروں اور مفسدوں کی عیاری بلکہ غداری بھی، جو چور تھے وہ کوتوال ہی کو چور ٹھہرا کر ڈانٹ رہے تھے، اور کوئی شبہ نہیں کہ سراغ رسانی کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا تھا، اس کی بنیاد یقیناً بجائے کسی خیر کے صرف شرارت ہی پر قائم تھی، لیکن بایں ہمہ حضرت والا کی زندگی اور آپ کی خدمات سے جو واقف ہیں وہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اپنی رپورٹ میں افسر نے حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا، یا حقیقت ہی پردہ بن کر اس کی سمجھ پر پڑ گئی تھی[1]۔

---

[1] خود اسی قصہ میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کی طرف یہ روایت بھی منسوب کی گئی ہے کہ اس واقعہ کے بعد یعنی سرکاری افسر کی ملاقات اور رپورٹ کے بعد حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اپنی رداء مبارک میں مجھے ڈھانپ کر کبھی اندر لاتے ہیں اور کبھی باہر لیجاتے ہیں، اسی سلسلہ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اکثر وقت یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رداء مبارک میں آپ کو لپٹے رہتے ہیں اور الگ کرنا نہیں چاہتے۔ عالم واقعہ کی اس کشفی آگاہی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسے نازک ترین حالات سے اس زمانہ میں مولانا نانوتوی گذر رہے تھے کہ براہ راست نبوت کبریٰ کی طرف سے آپ کی حفاظت و نگرانی کا انتظام کیا گیا تھا، بیچارہ مسکین سرکاری افسر کے بس کی بات تھی کہ عالمین کی رحمت کی چادر میں جسے پناہ دی گئی تھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حضرت والا کی عملی شرکت کا تفصیلی ذکر اپنے محل پر انشاء اللہ آئندہ کیا جائیگا، اس وقت یہی معلوم ہوگا کہ باوجود شدید کد و کاوش کے سیدنا الامام الکبیر کی گرفتاری میں حکومت کامیاب ہو سکی، ظاہر ہے کہ اتنی محفوظ شبستانی جسے میسر آگئی ہو اس پر ہاتھ ڈالنے کی گنجائش ہی کیا باقی رہ جاتی، افسوس ہے کہ وقت کے تقاضوں اور مصالح کا خیال کر کے سیدنا الامام الکبیر کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال حضرت والا کے سیاسی رجحانات اور اس راہ میں آپ کے عملی اقدامات و خدمات کا وہی انکار کر سکتا ہے، جس کے دل و دماغ پر اسی قسم کا پردہ پڑا ہوا ہو، جیسے اس سرکاری افسر پر پڑ گیا تھا، لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ طلب علم کی زندگی سے فارغ ہونے کے بعد اچانک آپ کے تغیر حال کی جو دردناک داستان مصنف امام نے سنائی ہے، کیا اس کے پیچھے صرف آپ کے سیاسی احساسات ہی پوشیدہ تھے؟

(بقیہ صفحہ ۲۷۸) سیاسی رجحانات و خدمات پر عموماً پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہی بات یعنی دیوبند کے مدرسہ کے قیام کی غرض کیا تھی، کسی دوسرے سے نہیں بلکہ براہ راست خاکسار نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے ایک خاص موقعہ پر سنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ناکام ہونے کے بعد حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو جو قائم کیا تو تعلیم سے زیادہ ان کی غرض کچھ اور تھی، صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہ رہے لیکن حاصل اسکا بھی قریب قریب ہی تھا، جس کا ذکر رامپور والے جاسوسی نامہ میں کیا گیا ہے، اور یہ روایت تو شاید دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، خاکسار نے بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سے سنا تھا کہ صوبجات متحدہ کے گورنر لارڈ میکڈانلڈ جنھوں نے اردو ہندی کا قصہ اس علاقہ میں کھڑا کیا، یہی میکڈانلڈ ایک دفعہ شملہ جاتے ہوئے دیوبند کے اسٹیشن سے گذر رہا تھا، اثناء میں گورنر صاحب کے ایک مسلمان افسر بھی تھے، ان سے اسٹیشن کا نام پوچھا اور یہ معلوم کرکے کہ یہی "دیوبند" ہے مسلمان افسر بیان کرتے تھے کہ چہرہ میکڈانلڈ کا متغیر ہو گیا اور غصہ میں بولنے لگا کہ ساری شرارتوں کا مرکز یہی مقام ہے، اسی وقت اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں دیوبند اور اس کے مدرسہ کا معائنہ میں خود کروں گا، تاریخ معائنہ کی مقرر بھی ہوگئی اور مدرسہ والوں کے پاس باضابطہ سرکاری اطلاع بھی پہنچ گئی اندرونی طور پر میکڈانلڈ کے فاسد ارادے کا علم بھی مدرسہ والوں کو مختلف ذرائع سے ہوتا رہا، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے لئے وہ بڑا نازک وقت تھا، ہم لوگ اس زمانہ میں جوان تھے، سیدھے حضرت گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچے اور لاٹ صاحب کی نیت سے مولٰنا کو مطلع کیا یہ مشہور ہے مولٰنا حبیب الرحمٰن بھی فرماتے تھے کہ حضرت والا مراقب ہو گئے، پھر سر اٹھا کر جوش کے عالم میں یہ فقرہ حضرت کی زبان پر جاری ہوا کہ "نہ لاٹ آئے نہ لٹوری" حکم دیا کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ مدرسہ کا کام کرو۔ لاٹ صاحب کے آنے کی تاریخ کے کچھ دن باقی ہی تھے کہ اچانک دیوبند اور اطراف دیوبند میں کالرا کی وبا پھوٹ پڑی، لاٹ صاحب نے ارادہ ملتوی کر دیا، اسی کے بعد ان کی مدت بھی ختم ہوگئی جس کا مطلب یہی ہوا حکومت بھی مدرسہ کے اس پہلو سے ناواقف یا کم از کم مطمئن نہ تھی جس کا ذکر رامپور کے بہی خواہوں نے حکومت تک پہنچایا تھا، بہر حال مجھے کہنا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے سیاسی میلانات کا قصہ ایسا قصہ نہیں ہے جس کی تحقیق کے لئے نکتہ آفرینیوں کی ضرورت ہو، آخر خود سوچنا چاہیے کہ "بن" جیسی معمولی چیز کو عمر بھر جس نے صرف اس لئے استعمال نہیں فرمایا کہ یہ نصاریٰ یعنی انگریزوں کی لائی ہوئی چیز ہے (دیکھو ارواح ثلثہ) خود انگریزوں اور انگریزوں کی حکومت کے متعلق اس کا کیا حال ہوگا۔ ۱۲

نکلا جارہا تھا، اس خبر سے کونسا مسلمان ہو گا جس کا کلیجہ سینہ سے نہ نکل پڑا ہو، یہ صحیح ہے جیسا کہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حوادث و مصائب کے برداشت کیلئے جن اعصابی قوتوں اور جسمانی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، سیدنا الامام الکبیر کو پیدا کرنیوالے نے ان سے بھی مالامال کر کے آپ کو پیدا کیا تھا۔

ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت آپ کے ایام طفولیت کی گذر چکی ہے کہ قصبہ نانوتہ میں آپکا گھر ایسی جگہ تھا، جس میں پہنچنے کے لئے ایک بڑی طویل گلی سے گذرنا پڑتا تھا، مصنف امام نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ بڑی وحشتناک جگہ تھی، وہاں آسیب بھی مشہور تھا، مگر بایں ہمہ وہی فرماتے ہیں کہ

"راتوں کو بہت بہت دیر سے بے تکلف گھر جاتے اور کچھ خوف نہ کرتے" ص۲۷

اور یہ قصہ تو بچپن کا ہے، وفات سے کچھ دن پیشتر آخری حج میں جب حضرت والا مکہ معظمہ سے واپس ہوئے اور جہاز پر سوار ہونے کے لئے جدّہ کی بندرگاہ سے کشتی پر روانہ ہوئے تو کشتی میں دوسروں کے ساتھ آپ کے تلمیذ عزیز مولانا منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی مرحوم بھی تھے، یہی مولانا منصور علی خاں راوی ہیں کہ کشتی جب ساحل سمندر سے جہاز تک پہنچنے کے لئے کھلی، تو

"اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں ادھر ادھر قریب غرق ہونے کے جھک جاتی تھیں"۔

مولانا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ کشتی پر جو لوگ سوار تھے،

"ہر ایک کا رنگ زرد ہو جاتا تھا"۔

مگر کشتی کے جھکولوں سے جن لوگوں کے چہرے زرد پڑ جاتے تھے، ان ہی میں مولوی منصور علی خاں صاحب مرحوم اپنے استاذ (سیدنا الامام الکبیر) کو دیکھ رہے تھے، فرماتے ہیں کہ

"مگر مولانا مرحوم اپنے حال پر رہے" (مذہب منصور ص۱۸۲)

ابتداء و انتہاء کی ان شہادتوں کے ساتھ زندگی کی درمیانی منزل کی یہ شہادت بھی مصنف امام کی زبانی سن لیجئے، غدر کے ہنگامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھنے کے بعد کہ

"اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے"

وہی یہ گواہی دیتے ہیں کہ

ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے ہوئے نہ دیکھا، خبروں کا اس وقت چرچا تھا، جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں، مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے" ص۱۵۱

یہ اور اس قسم کی بیسیوں شہادتیں جن کا ذکر اپنے اپنے محل پر انشاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں بھی کیا جائیگا، ان کو دیکھتے ہوئے "جذباتیت" یا "مغلوب الحالی" کی اس کیفیت کے انتساب کی آپ کی طرف کوئی جرأت نہیں کرسکتا، جس میں اعصابی ضعف کے مریضوں کو عموماً مبتلا پایا گیا ہے، ہوتے تو ہیں یہ بے چارے جسمانی اور مادی بیماری کے شکار، لیکن اس بیماری کے آثار کا ظہور وقتی محرکات کے زیر اثر ان پر جب ہوتا ہے، تو ان کی مذبوحی حرکات کو روحانی کیفیات کا ثمرہ قرار دیا جاتا ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا سیدنا الامام الکبیر کے متعلق تو اس کا اندیشہ بھی بد اندیشوں کے سوا کسی متوازن فکر و عقل رکھنے والے کو نہیں ہوسکتا۔

لیکن جسمانی نظام اور اعصابی استحکام کی گواہیاں دینے والوں ہی سے اسی کے ساتھ اس قسم کے مشاہدات کی روایتیں بھی جب ہم سنتے ہیں، مثلاً وہی مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی مرحوم جنہوں نے بحر عرب کے طوفانی تلاطم میں سیدنا الامام الکبیر کو اپنے حال پر قائم و دائم پایا تھا، ذکر یہ لکھتے ہوئے کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا راوی ہیں کہ

"اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا، اور ایک عجیب حالت نمایاں ہوتی تھی، جو معرض بیان میں نہیں آسکتی" ص۱۸۱

اور اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ "قالب" آپ کا خواہ جتنا بھی آہنی ہو، لیکن اسی آہنی قالب میں قلب مبارک کا جو آبگینہ محفوظ تھا، وہ کتنا رقیق و لطیف، کتنا نازک و حساس تھا، ایسی صورت میں اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان زبوں حالیوں سے آپ کو جتنا بھی متاثر تسلیم کیا جائے یقیناً اسکی گنجائش ہے، لیکن صرف ان ہی "سیاسی عوامل و مؤثرات" کے ساتھ آپ کے ان حالات کو وابستہ

اس ذہنیت کی ٹھیک ٹھیک صحیح ترجمانی مولانا گنگوہی کے اس فقرے سے ہو رہی ہے، جو مدرسہ کی طالب العلمانہ زندگی پیدا کر دیتی ہے، یہ سچ ہے کہ اس وقت مولانا گنگوہی کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوگی، لیکن قابلیت کے لحاظ سے ترقی کر کے اس منزل تک وہ پہنچ چکے تھے جس میں علم کے پیچیدہ مسائل کے سمجھنے کا استحقاق طالب العلم کو حاصل ہو جاتا ہے، مگر جس قسم کی زندگی اس وقت وہ گذار رہے تھے اس کا لازمی نہ سہی تاہم ایسا نتیجہ ضرور ہے جس کا مشاہدہ عربی مدارس کے طلبہ کی اکثریت میں آج بھی کیا جا سکتا ہے، اسی لئے اس پر مجھے تعجب نہ ہوا، ہاں حیرت کی بات وہ ہے جس کا ذکر اسی کے بعد مولوی عاشق الٰہی صاحب نے کیا ہے کہ مولانا گنگوہی جس وقت یہ فرما رہے تھے کہ "اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا" ٹھیک اسی وقت ان کے رفیق درس جو عمر میں حالانکہ ان سے چھوٹے تھے یعنی سیدنا الامام الکبیر مولانا گنگوہی سے فرما رہے تھے:

"بابا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں، اور ایسے ایسے ہیں"

مولوی عاشق الٰہی نے غالباً براہ راست خود مولانا گنگوہی سے اس قصہ کو سنا تھا، یا سننے والوں سے نقل کیا ہے، بہر حال اس قصہ کا تذکرہ خود مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے اور آخر میں فرماتے کہ

"ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے"

خیال کرنے کی بات ہے، اپنے عہد میں "قلوب" کا جو طبیب اعظم قرار دیا گیا اور دیدۂ باطن نے "قلب ارشاد" کی لاہوتی بلندیوں پر جس کے جھنڈے کو لہراتا ہوا پایا، اپنی طالب العلمی کے دنوں میں خود ان ہی کا اعتراف ہے کہ اس راہ کے راہ بر سے وہ بے خبر تھے۔ "اجتنابیت" کے سوا آخر اس کی توجیہ اور کیا کی جائیگی کہ ان ہی کے دوسرے رفیق ٹھیک طالب العلمی کی اسی زندگی میں یہی نہیں کہ خود ہی اس سے باخبر تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی خبر دے رہے تھے۔ اس وقت "ایسا نہ کہو" کا جو مشورہ دیا گیا اس سے تو شاید مخبری کی ابتدا ہوئی، ورنہ جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اللہ سرہ سے چونکہ خلوت وجلوت کی شرکت تھی"

تھی، کہ آئے تھے آگ لینے کے لئے، اپنی علمی فضلیت کا سکہ جمانے کے لئے کہ اچانک حاجی صاحب قبلہ کی زبان مبارک سے یہ سن کر کہ

"ہاہا ایسا ارادہ نہ کرنا میاں! وہ ہمارے بزرگ ہیں، بڑے ہیں" (ص۴۶ ج ا)

ایسا معلوم ہوا کہ نہ علم کا ادعا باقی تھا، اور نہ مناظرے کا ارادہ، ایک فقرے نے سب کو جلا کر بھسم کر دیا، آئے تھے کہ تھانہ بھون کے شیخ کو چت کریں گے، مگر دیکھا گیا کہ اسی تھانہ کے ایک دوسرے شیخ کے قدموں پر گرے ہوئے ہیں، اسی کے بعد مفت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے لیکن شاید آپکی مولویت ہی کا اقتضار تھا کہ صاف صاف لفظوں میں اپنے پیر حاجی صاحب سے مولنا گنگوہی نے فرما دیا تھا کہ

"مجھ سے ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ رات کو اٹھایا جائے" (ص۴۶ ج ا)

مگر ہوا کیا؟ اس سوال کا جواب خود ہی دیا کرتے کہ

"پھر تو مرمٹا" (ص۴۸)

بہر حال جو صورت حال حضرت مولنا گنگوہی کے ساتھ پیش آئی ہے، جہاں تک فقیر کی محدود معلومات ہیں عام طور پر دوسرے علماء کو بھی اس راہ میں قدم رکھتے ہوئے کچھ اسی قسم کے قصے پیش آئے ہیں، ابتداء میں وہ بھڑکے ہیں، بدکے ہیں، ہچکچائے اور کسمسائے ہیں، گرے بھی ہیں، تو کافی کشمکش کے بعد گرے ہیں، اسی لئے ان کی زندگی کا یہ "مرحلہ" دلچسپ ہو گیا ہے، عموماً بعد کو خود بھی اور دوسرے بھی اس کا ذکر کرتے رہے ہیں۔

لیکن خلاف دستور سیدنا الامام الکبیر بھی حالانکہ مدرسہ ہی کی راہ سے خانقاہ کی طرف یا ظاہر سے گذرنے کے بعد باطن کی طرف آئے تھے، لیکن اتنی سہولت اور خاموشی کے ساتھ آئے کہ نہ اس زمانہ میں کسی کو یہ محسوس ہوا کہ کوئی انقلابی قدم آپ نے اٹھایا ہے، اور نہ بعد والوں کو اس کیطرف توجہ ہوئی، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کب مرید ہوئے کہاں مرید ہوئے، کس طرح مرید ہوئے، کن حالات اور واقعات کے بعد مرید ہوئے، ان میں سے کسی ایک سوال کو

بھی آپ کے حالات کے بیان کرنے والوں نے نہیں چھیڑا ہے،
سوانح مخطوطہ میں صرف یہ لکھ کر کہ

"علم باطنی کی تحصیل حضرت فخر المشائخ مرکز خواص و عوام منبع برکات قدسیہ، مظہر
فیوضات مرضیہ، جناب حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی سلمہ اللہ تعالیٰ سے فرمائی" ص ۹

سوانح نگار صاحب آگے بڑھ گئے، خود ہمارے مصنف امام نے بھی اس کا تذکرہ کر کے کہ ان کے والد مرحوم
مولانا مملوک العلی دلی سے نانوتہ وطن آتے جاتے تھانہ بھون میں حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی قیام
فرمایا کرتے تھے، صرف ان الفاظ پر قناعت کی ہے کہ

"غرضکہ یہ آنا جانا اور ملاقاتیں ان صاحبوں کی خدمت میں حصول
نیاز کا سبب ظاہراً ہوئیں، ورنہ جو لکھا تھا وہ ہر طرح ہوتا تھا" ص ۳۲

اور سچ تو یہ ہے کہ مولوی اگر فقیری اختیار کرے، تو یہ واقعہ مستحق ہے کہ اس کا چرچا کیا جائے، اور اگر فقیر
نے فقیری اختیار کی تو ظاہر ہے کہ اس کا بھلا کوئی کیا ذکر کرے، چڑھنے والوں کے گرنے کو لوگ محسوس
کر سکتے ہیں، مگر جو بیچارا خود ہی گرا ہوا ہو وہ گرے گا کیا اور کسی کی توجہ اس کے گرنے پر آخر کیوں ہو،
حد تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تاریخ تک معلوم نہیں، صرف مولوی عاشق الٰہی صاحب نے اپنی کتاب تذکرۃ الرشید
میں اور وہ بھی حاشیہ میں اتنی بات لکھی ہے، حضرت مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید
کرایا، اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا" ص ۴۶/۱

اور اسی سے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حاجی صاحب سے پہلے مولانا گنگوہی مرید ہوئے
اور آپ کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب حاجی صاحب کے باضابطہ حلقہ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے
اسی سلسلے میں مولانا عاشق الٰہی صاحب نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

"مولانا النانوتوی کو اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاتھ پر بیعت کرانے
کی کوشش کا ثواب بھی حضرت گنگوہی کو حاصل ہوا" ص ۴۶/۱ حاشیہ تذکرۃ الرشید)

ہے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ کئی دن اسی کشمکش میں گذر گئے، ایک دن حاجی صاحب کے رفیق طریق حضرت
حافظ ضامن صاحب شہید کے استفسار پر بلبلا کر فرمانے لگے کہ کیا کروں،
سید صاحب دل کا میلان ہے (یعنی حاجی صاحب) وہ قبول نہیں کرتے اور دوسرے (مولانا شیخ محمد
صاحب) اپنی طرف کھینچتے ہیں عجب قصہ ہے "، ص ۴۴

تو حضرت شہید نے بظاہر سفارشی بننے کا فرض انجام دیا، اور جس پر اور جس کی تربیت و تعلیم پر مرشدنا مولانا گنگوہی
کے مقصد ہو چکا تھا، آخر اسی کی غلامی میں داخل ہو گئے۔ رحمۃ اللہ علیہم وطاب ثراہم،
بات ذرا طویل ہو گئی، لیکن دلچسپ تھی، اور اسی کے ساتھ مولانا عاشق الٰہی کی روایت سے ممکن ہے
بعضوں کو حیرت ہوتی اس لئے ان قصوں کو مختصراً دہرانا پڑا، ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب
قبلہ اور ان کے وفادار خادم ہمارے سیدنا الامام الکبیر کے ابتدا ہی سے تعلقات کی نوعیت وہی تھی جو پیر و
مرید کے درمیان ہوتی ہے،
خواہ ظاہری اور رسمی بیعت کی نوبت نہ آئی ہو، اسی کا نتیجہ ہے کہ اشارۃً کنایۃً کسی طرح سے یہ نہیں معلوم
ہوتا کہ حاجی صاحب کے علاوہ سیدنا الامام الکبیر نے اپنی پوری زندگی میں ظاہراً یا باطناً ایک لمحہ کے لئے بھی
اس سلسلہ میں کسی اور کی طرف کبھی کسی زمانہ میں کسی قسم کی ہلکی سی بھی توجہ کی ہو، حالانکہ حضرت مولانا شاہ
عبد الغنی محدث و مہاجر رحمۃ اللہ علیہ جیسے مولانا گنگوہی کے استاذ حدیث تھے، گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر کو
بھی حدیث میں آپ ہی سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور ان کے سوا بھی اس وقت تک دلی آخر اتنی اجڑی
ہوئی تو تھی کہ دوا دوش کی ساری دکانیں اٹھ گئی ہوں، مگر مولانا تھانوی کی شہادت گذر چکی کہ سیدنا الامام
الکبیر کو قدرت نے حاجی صاحب قبلہ کے لئے زبان و لسان بنا کر پیدا کیا تھا، یہ خود ان کے مرشد و

ـہ اپنے جن ذہنی تاثرات کا اشارہ مولانا گنگوہی نے ان الفاظ سے کیا ہے مجھے تو اس میں بھی حضرت حاجی صاحب کے
باطنی تصرف کی نشانیاں نظر آتی ہیں خیال کرنے کی بات ہے کہ جسے جیت کر کے آئے تھے وہی آپ کو پچھاڑنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہی
اور کہتا ہے ... کیفیت مجھ پر ... کچھ کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاہا ایسا نہ کرنا وہ تو پیر بڑے
ہیں حاجی صاحب کے ان الفاظ نے سب کچھ کو میٹ کر رکھ دیا جو گنگوہ سے آپ کے ساتھ آیا تھا اور مدرسہ کی تعلیم
نے آپ کے اندر جسے کچھ دن کے لئے داخل کر دیا تھا۔

تنقیدی صدا چونکہ نہیں اٹھی، اس لئے یہ بھی مشکل ہے کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کی تفصیلات میں شک اندازی کی جائے، پس مناسب یہی ہے کہ تطبیق کا طریقہ اختیار کر کے تاویل و توجیہ کی کوئی راہ نکالی جائے جس کی جہانتک میرا خیال ہے کافی گنجائش ہے، لیکن اس مسئلہ کا زیادہ تر تعلق حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ بیعت سے ہے، نیز غیر ضروری طوالت کا بھی خوف ہے، اس لئے تاویل و توجیہ کے اس کام کو پڑھنے والوں کے ذاتی مذاق کے سپرد کر کے جو کچھ مجھے یہاں عرض کرنا ہے، اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں،

کہنا یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خواہ جو صورت بھی پیش آئی ہو، لیکن اپنے مصنف امام کی مذکورہ روایت اور اس کے سابقہ ولاحقہ فقروں کی روشنی میں بہر حال اتنی بات تو ماننی ہی پڑیگی کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں کم از کم سیدنا الامام الکبیر ضرور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صرف حلقہ ارادت ہی میں شریک نہیں ہو چکے تھے، بلکہ مصنف امام کے الفاظ کا اقتضا یہی ہے کہ باطنی سیر و سلوک کے مشاغل میں بھی حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا،

بلکہ سیدنا الامام الکبیر کے متعلق غالباً کسی موقعہ پر یہ بات جو شاید گذر بھی چکی ہے اور عام طور پر مشہور یہی ہے کہ ذکر و شغل کی تعلیم شروع شروع میں حاجی صاحب قبلہ سے پانے کے بعد جیسے دوسرے لوگ حاجی صاحب کی خدمت میں ذکر و شغل کے آثار کا تذکرہ کیا کرتے تھے، سیدنا الامام الکبیر نے چند دنوں تک کسی قسم کی کوئی بات اس سلسلہ میں اپنے مرشد کے آگے بیان نہیں کی، اور حاجی صاحب کے دریافت فرمانے پر کہ "آپ کچھ نہیں کہتے" مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ جواب میں حضرت نانوتوی آب دیدہ ہو کر حاجی صاحب سے عرض کرنے لگے کہ

"حضرت حالات و ثمرات تو بڑے لوگوں کو ہوتے ہیں، مجھ سے تو جتنا کام حضرت نے فرمایا ہے وہ بھی نہیں ہوتا"

اور اپنی اس عجیب و غریب کیفیت کا جو ذکر شروع کرتے ہوئے آپ پر طاری ہوئی تھی ان الفاظ میں اظہار فرمایا کہ

"جہاں تسبیح لے کر بیٹھا، بس ایک مصیبت ہوتی ہے، اس قدر گرانی کہ جیسے سوسو من کے پتھر کسی نے رکھدیئے ہوں، زبان و قلب سب بستہ ہوجاتے ہیں"۔

یہ بھی حضرت تھانوی ہی کی روایت میں ہے کہ روتے ہوئے بے ساختہ آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ

حضرت کے کامل یا شفیق ہونے میں شبہ نہیں لیکن

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل ❊ کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

میں ہی بدقسمت ہوں، ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے زبان کو جکڑ دیا ہو" (قصص الاکابر الہادی ماہ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ)

آپ کی اس کیفیت کو سننے کے بعد وہی بات حاجی صاحب نے فرمائی تھی، جسے پہلے بھی کہیں بیان کرچکا ہوں کہ بشارت دیتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی تسلی حاجی صاحب نے ان الفاظ میں کردی کہ

"مبارک ہو، یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے، اور یہ وہ ثقل ہے، جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا"۔

مسئلہ کے لحاظ سے اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا شاید اسے عرض کرچکا ہوں، یہاں اس کے ذکر سے یہ غرض ہے کہ حضرت تھانوی نے اس قصہ کو بیان کرکے یہ بھی فرمایا کہ

"اس زمانہ میں (یعنی جب یہ حال طاری ہوا تھا) مولٰنا نانوتوی محض نو آموز طالب العلم تھے اس وقت یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ، یہ اس قدر بڑے عالم ہونے والے ہیں"

جس سے مصنف امام کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ طالب العلمی کے زمانہ میں ہی ذکر و شغل سیر و سلوک میں مرید کرنے کے بعد حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا"۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک وقتی حال تھا، مرشد کی توجہ سے جیسا کہ معلوم ہے اس کا ازالہ ہوگیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، ترتیب کے ساتھ تو کسی نے اس کو بیان نہیں کیا ہے، لیکن سوانح مخطوطہ کے مصنف نے سیدنا الامام الکبیر کی باطنی صلاحیتوں اور جن خداداد نعمتوں کو لیکر آپ پیدا ہوئے تھے

مسلسل جس کی تعبیر اپنی اصطلاح میں "اجتبائیت" سے کرتا چلا آرہا ہوں، ان ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آنِ واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہو گئے، جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئی"

اسی کے بعد یہ بھی ان ہی کا بیان ہے، کہ

"شیخ نے جب آپ کو اس فن کے قابل پایا تو فرمایا کہ تم کو کسی ریاضت کی حاجت نہیں"

اگر روایت صحیح ہے، تو نہیں کہا جا سکتا کہ ذکر کے وقت شروع میں ثقل و گرانی کی جو کیفیت آپ کو محسوس ہوئی تھی، اس کو دیکھ کر شیخ نے یہ فرمایا کہ "تمکو کسی ریاضت کی ضرورت نہیں" یا بیعت لینے کے ساتھ ہی یہ کہدیا تھا، بظاہر پہلی ہی بات دل کو زیادہ لگتی ہے، کیونکہ شیخ کی روشن ضمیری کے باوجود بھی ایسے شیوخ کو جن کے ہاتھ پر بکثرت لوگ بیعت کر رہے ہوں، کسی خاص مرید کی خصوصی صلاحیتوں کا اندازہ عموماً کچھ اسی قسم کے امتیازی آثار و حالات سے ہوتا ہے، خصوصاً ایسا مرید جو بقول مولانا تھانوی ابھی نو آموز طالب العلم کی حیثیت سے بظاہر آگے نہ بڑھا ہو،

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ ثقل و گرانی والی حالت کے اظہار ہی کے بعد غالباً حضرت حاجی صاحب نے اجازت دے دی کہ صوفیانہ ریاضتوں کی آپ کو ضرورت نہیں ہے، مگر ہوا کیا! شیخ کی طرف سے بار ہلکا کیا جا رہا ہے، سنئے، سوانح مخطوطہ کے مصنف کی شہادت دہی لکھتے ہیں کہ

"مگر با ایں ہمہ شان عبودیت آپ پر (مولانا نانوتوی پر) ایسی غالب تھی کہ آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم ذکر ارہ وغیرہ میں مشغول رہے"

اور کیسی مشغولیت؟ تصور بھی آج جس کا دشوار ہے، ان کا بیان ہے کہ

"چھ چھ سات سات گھنٹے برابر ذکر ارہ اور حبس دم کرتے تھے"

آگے یہ لکھ کر کہ

کچھ دن تو وہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ رہے، لکھا ہے کہ

"ایک سال کے قریب بعد انتقال والد مرحوم احقر دہلی رہا" ص۲۹

لیکن اسی کے بعد جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ

"پھر اجمیر نوکری کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) سے جدائی پیش آئی" ۲۹

غالباً اسکول کے ہیڈ مولوی یا ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات ہو کر مصنف امام کو اجمیر جانا پڑا، آگے وہی یہ خبر بھی دیتے ہیں کہ

"جب احقر اجمیر گیا مولوی صاحب اسی مکان (کوچہ چیلان والے) میں رہتے تھے، اور بعض ایک دو آدمی اور تھے" ص۳۰

یہ کون لوگ تھے اس کا پتہ تو نہ چلا، بس اتنا معلوم ہوا کہ مصنف امام کے چلے جانے کے بعد بھی اس مکان میں کچھ دنوں بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت والا کو رہنا پڑا، اور حراء بنانے یا حرائی تجربات کے لئے قدرت نے جس مقام کا انتخاب کیا تھا، ابھی غیروں سے خالی نہیں ہوا تھا، واللہ اعلم پھر کیا صورت پیش آئی، مصنف امام نے صرف یہ خبر اجمالی الفاظ میں دی ہے کہ وہی ایک دو آدمی جو آپ کے ساتھ اس مکان میں مقیم تھے،

"اتفاق سے سب متفرق ہو گئے" ص۳۰

اتفاق سے تفرق کا یہ نتیجہ اگرچہ بظاہر تو اتفاقی واقعہ تھا، لیکن بعد کو اس "تفرق" سے بندے اور بندے کے مالک کے درمیان وفاق کی جو صورت پیش آئی، اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اتفاق سے نہیں، بلکہ توفیق کی غیبی قوتوں کے اتفاق نے اس صورت حال کو شاید قصداً پیدا کیا تھا مصنف امام ہی راوی ہیں کہ جب یہ ایک دو آدمی بھی متفرق ہو گئے تو

"اور مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) تنہا رہ گئے" ص۳۰

پھر کیا ہوا اور کیا ہونا رہا، میں کیا کروں، ذہن اچانک دلی کے اس کوچہ چیلان سے وادی غیر ذی زرع کے اس پہاڑ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے غار کو تیرہ سو سال پہلے آقا کے لئے خالی کرایا گیا تھا،

اللّٰہم صل علیہ وسلم وبارک ؛

مصنف امام ہی کے الفاظ سنئے "جو سب کے متفرق" ہونے کے بعد اتفاقات کہئے یا وفاقات کی جو صورتیں اس تنہا مکان میں پیش آئیں وہی رقمطراز ہیں کہ

"مکان مقفل رہتا تھا" صہ۳

بہ ظاہر دن کو بھی مقفل رہتا تھا اور رات کو بھی مقفل ہی رہتا تھا۔ مگر باہر سے جو مکان دیکھنے والوں کو مقفل نظر آتا تھا، دن کو تو نہیں، لیکن جب دن ختم ہو جاتا اور رات اپنی تاریکی کے پردے میں دنیا کو چھپا لیتی تھی، اس وقت جیساکہ مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

"رات کو مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے" صہ۳

شاید یہ اسی لئے کیا جاتا تھا کہ آنے والے راہ گیروں پر بھی اثر قائم رہے کہ کوئی اس مکان میں نہیں ہے۔ اور تنہائی میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اسی کواڑ چڑھائے ہوئے مقفل مکان میں تن تنہا ساری رات گذرتی تھی یا گذاری جاتی تھی، پھر بقول مصنف امام

"اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے" صہ۳

اس مقفل مکان میں تنہا، شب باشی، وشب گذاری کی یہ عجیب وغریب صورت حال کبتک پیش آتی رہی، صحیح طور پر تو اس کا بتانا دشوار ہے، لیکن مصنف امام نے آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے

"چند ماہ اسی ہُو کے مکان میں گذر گئے"...... صہ۳

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند روز نہیں، بلکہ چند مہینوں سے کم اس کی مدت نہ تھی؛ شاید "ہو" کے اسی مکان کا وہ مشہور واقعہ ہے، جس کا ذکر خاکسار سے براہ راست حضرت مولٰنا حبیب الرحمٰن العثمانی سابق مہتمم دارالعلوم بھی فرمایا کرتے تھے، اور مولٰنا الطیب الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الاسلام مولٰنا سید حسین احمد مدنی مدظلہ العالی کے حوالہ سے اپنے گرامی نامہ میں اس کی توثیق فرماتے ہوئے کہ دلی ہی کے قیام کے زمانہ میں یہ واقعہ کہا جاتا ہے پیش آیا ؛

گنجائش کے مطابق ان لوگوں کو کرایا جاتا ہے جو ان مجاہدات و ریاضات کی محنتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور اپنی اپنی ہمت کی بات ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر کسی سے نہ اس کا مطالبہ کیا گیا ہے اور اُن کے متعلق نہ کوئی مسئول ہوگا اور نہ اُن کے ترک پر سرزنش کی دین میں دھمکی دی گئی ہے:

سیدنا الامام الکبیر کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں، اُن کے بچپن کے ساتھی یعنی ہمارے مصنف امام کی شہادتیں گذر چکی ہیں، کہ

"مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے، ہر کھیل میں خواہ ہوشیاری کا ہو یا محنت کا سب سے اول اور غالب رہتے تھے" ص۲۷

یہ بھی اُن کی اطلاع ہے کہ

"ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا، وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے" ص۲۷

"کمال کا جو مرتبہ ہوتا" اس مرتبہ تک "ہر کھیل" کو پہنچانے کا جذبہ جس پر جبلۃً غالب اور مستولی تھا، اسی شخص کے متعلق یہ سوال کہ پیر و مرشد کے غیر ضروری قرار دینے کے باوجود اتنے شدید مجاہدات و ریاضات کی مشقتوں میں اپنے آپ کو اسی نے کیوں مبتلا کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حضرت والا کا یہ فطری رجحان تھا، شیخ نے تو صرف غیر ضروری ٹھہرایا تھا، لیکن ان ریاضتوں اور مجاہدوں سے اگر وہ منع بھی کر دیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت اُن کا طرز عمل کیا ہوتا، لیکن غیر ضروری قرار دینے میں گنجائش باقی تھی، خود جب مصر ہوئے ہوں گے، تو "معرفت و شناخت" کے نتیجے تک پہنچنے کے لئے جو طریقے مقرر ہیں، شیخ نے اُن کی تعلیم سے سرفراز فرمایا اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کتنی قوت کے ساتھ اس "غیر ضروری" فرض کو آپ نے انجام دیا:

اس راہ سے جو قطعاً ناآشنا ہے، وہ کیا بتا سکتا ہے کہ "جذب کی حالت برستی تھی" ان الفاظ سے مصنف امام نے آپ کی زندگی کی جس منزل کی تعبیر کی ہے، اور خبر دی ہے کہ بال سر کے بڑھ گئے تھے، نہ دھونا، نہ کنگھی نہ تیل نہ کترے، نہ درست کئے، الغرض ان ہی کے الفاظ میں حضرت والا کی جو "عجب صورت" بن گئی تھی، اکثر ساکت رہتے تھے "اور" باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو اور مغموم جیسی صورت رہتے"۔

حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت والا سے تلمذ کا شرف اس زمانے میں ملا جس کے بعد ہی آپ کی وفات خود ان کے سامنے ہوئی، انھوں نے دیکھا تھا، جیسا کہ خود ہی لکھتے ہیں کہ

"یادِ الٰہی سے کسی وقت غافل نہ تھے، ہمہ تن ذکر بن گئے تھے" ص۱۹۶ مذہب منصور

اللہ اللہ جس کا حال یہ ہو جیسا کہ مولانا منصور علی خاں ہی نے بیان کیا ہے کہ "ہر لقمہ خواہ کھانے کا ہو، یا میوہ یا شیرینی کا بسم اللہ ضرور کہا کرتے" ص۱۹۱ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نام اور اسم کے ساتھ گرویدگی کی یہ کیفیت ہو تو نام والے کے ساتھ اس کے قلبی تعلق کی کیا کیفیت ہو گی، لیکن جہاں تک واقعات کا اقتضا ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس راہ میں آپ کی مشغولیت عروج و شباب کے انتہائی نقطہ تک اسی زمانہ میں پہونچ گئی تھی جس زمانہ میں کوچہ چیلان کے "ھو" والے مکان میں آپ کو کامل یکسوئی کا موقعہ میسر آیا تھا، اور اس راہ کے آخری نتائج آپ کے سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کے ان ہی ایام میں آچکے تھے، وقت کے مسلم عند الکل قطب، اور اس راستہ کے مشہور ماہر سیدنا حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی یہ شہادت کہ

"مولانا محمد قاسم کو کم سنی ہی میں ولایت ہو گئی" (کمالات رحمانی ص۱۶۰)

جس کا ذکر شاید پہلے بھی کہیں کر چکا ہوں خود اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

"مقام ولایت" سے کمسنی ہی میں سرفرازی کا شاید یہ نتیجہ ہے، کہ باوجود شدید اخفار حال کے اس کے آثار و ثمرات کے تجربہ و مشاہدہ کا موقعہ کمسنی کے بعد والی زندگی کی ہر منزل میں لوگوں کو ملتا رہا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

"مولانا مرحوم سے رات دن، کھلی کرامتیں سرزد ہوتی تھیں"

حالانکہ وہی یہ بھی اسی کے بعد لکھتے ہیں کہ

"اپنی خاکساری کی وجہ سے ان کو ایسا چھپاتے تھے جیسے پانی کنوؤں کی تہ میں، اور ہرگز اس کے اظہار کو پسند نہ فرماتے تھے" ص۱۲

ہم نے کسی کتاب میں تو نہیں پڑھا ہے، لیکن اکابر دیوبند سے کہہ سکتا ہوں کہ مختلف طریقوں سے یہ خبر

مجھ تک پہنچی ہے، کہ یہی ۱۸۵۷ء جس کے چندہی سال بعد غدر کا ہنگامہ ہوا، آئندہ اس میں آپ کی عملی شرکت کے واقعات بیان کئے جائیں گے، اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں گولی لگی، سر پکڑ کر بیٹھ گئے عمامہ سر پر بندھا ہوا تھا، لوگ دوڑے، مگر اُن کی حیرت کی انتہا نہ تھی کہ کسی قسم کا کوئی اثر گولی کا نہ عمامہ میں محسوس ہوا اور نہ سر مبارک میں، ہمارے مصنف امام نے بھی اشارۃً اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"گولی کا نشان تک نہ ملا، حالانکہ خون سے کپڑے تر تھے" ص۳۷

اسی طرح پور قاضی کے شیعوں کی مجلس کا وہ واقعہ جس میں کہا جاتا ہے کہ شیعوں کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا کہ سرورِ کائنات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری ہمیں کرا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ سنوا دیجئے کہ جو کچھ تم (یعنی مولانا نانوتوی) کہتے ہو سچ ہے، تو ہم لوگ سنی ہو جائیں گے۔

ارواح ثلثہ میں ہے کہ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ

"تم سب اس پر پختہ رہو، تو میں بیداری میں زیارت کرانے کے لئے تیار ہوں" ص۲۰۱

حضرت والا کے ایام شباب اور جوانی کے جوش ہی کا اسے نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ مخالفوں سے مباحثہ و مناظرہ و مقابلہ کی پھر کسی مجلس و محفل میں نہ آپ کی طرف سے اس قسم کے دعاوی جہانتک میں جانتا ہوں پیش ہوئے، اور نہ بجائے عام علمی طریقوں کے اس سلسلہ میں کسی غیر معمولی باطنی قوت سے کام لیتے ہوئے آپ کو کبھی پایا گیا۔[1]

---

[1] صرف ایک سماعی روایت اس سلسلہ میں مجھ تک پہنچی ہے پورے طور پر یاد نہ رہا کہ خود حضرت شیخ الہندؒ نے بیان کیا تھا یا ان سے کسی نے سنایا تھا اور وہ یہ ہے کہ مناظرے کی کسی مجلس میں فریق مخالف نے تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، سیدنا الامام الکبیر نے اس وقت ایک ایسی تقریر اس مسئلہ کے متعلق فرمائی کہ ساری الجھنیں جو اس میں پیدا ہوتی ہیں ایک ایک کر کے معلوم ہوتا تھا کہ سلجھتی چلی جا رہی ہیں، مجلس میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے دوسرے رفقا بھی شریک تھے اس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آج تو حضرت نے ایسی تقریر کی جو کبھی سننے میں نہیں آئی، خیال آتا ہے کہ بعضوں نے اسی وقت نوٹ بھی کر لیا، مسئلہ کے متعلق پوری مجلس مطمئن نظر آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہا، مجلس کے برخواست ہونے کے بعد جب یہی حضرات جنکی حیثیت اس وقت طلبہ کی تھی فرودگاہ پر واپس آئے اور چاہا کہ ذہن نشین کرنے کے لئے تقریر کا اعادہ کریں، تو نظر آیا کہ کچھ الجھنیں ہم بھی باقی ہی رہ گئی ہیں۔ وہ وکد کے بعد اپنے سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تقریر جس وقت ہو رہی تھی کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا، مگر وہاں سے واپسی کے بعد کچھ خدشے بدستور کھٹک رہے ہیں۔ تب سیدنا الامام الکبیر نے مسکرا کر فرمایا کہ کبھی مخاطب کے فہم کے مطابق تقریر کی جاتی ہے اور کبھی ضرورۃً مخاطب کی سمجھ ہی کو اپنی تقریر کے مطابق بنا لیا جاتا ہے۔ شاید اسی قسم کے الفاظ تھے حاصل جس کا یہی سمجھا گیا کہ باطنی تصرف سے اس وقت کام لیتے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ ہی کو ایسا بنا لیا گیا کہ اس وقت ان سے جو کچھ کہا جاتا وہی مان لیتے۔

ہو عرف بحث و مباحثہ کی مجلسوں اور محفلوں ہی میں نہیں، بلکہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو حتی الوسع حضرت والا پوشیدہ رکھنے کی بلیغ کوشش فرماتے تھے انھوں نے اسی کے ساتھ جو یہ لکھا ہے کہ "رات دن کرامتیں سرزد ہوتی رہتی تھیں" شاید اس سے اشارہ اسی قسم کے واقعات کی طرف ہے، جن سے صرف وہی لوگ واقف ہو سکتے تھے جو صبح و شام حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا شرف رکھتے تھے مثلاً مولٰنا منصور علی خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ آخری حج جس میں ہمرکابی کی سعادت ان کو بھی میسر آئی تھی، واپسی میں جب آپ بیمار ہوئے لکھا ہے کہ

"جہاز میں ایسے بیمار ہو گئے کہ اٹھنے بیٹھنے کی بالکل طاقت نہ رہی، بار بار استفراغ ہوتا تھا یہ خادم (مولٰنا منصور علی خاں) اٹھا کر بٹھاتا، اور سلفچی میں استفراغ کراتا تھا، صرف صفرا ہی نکلتا تھا، کلی کرا کر پھر لٹا دیتا تھا، دن رات میں کسی وقت اسقدر سکون نہ تھا کہ اچھی طرح خواب راحت ہو، ذرا دیر ہوئی کہ استفراغ کا تقاضا ہوا"

مگر وہی مریض جس میں نشست و برخاست کی قوت باقی نہ رہی تھی، اور غثیان کے دورے دم لینے کی بھی جسے فرصت نہیں دے رہے تھے، بقول مولٰنا منصور علی خاں

"ہر وقت لیٹے ہی رہتے تھے"

لیکن اسی کے ساتھ جہاز کے اس پورے سفر میں اس کا مشاہدہ بھی شب و روز کے پانچوں وقتوں میں کیا کرتے تھے کہ

"جب نماز کا وقت آتا دہ استفراغ موقوف ہو جاتا، اور بیٹھ کر اطمینان سے نماز پڑھتے"

مگر جوں ہی کہ اطمینان کے ساتھ نماز ادا ہو جاتی، وہی بیان کرتے ہیں کہ

"نماز کے بعد پھر وہی دورہ پے در پے شروع ہو جاتا" (مذہب منصور ص۱۸۵)

یا اسی قسم کے ایک دوسرے واقعہ کا ذکر مولانا منصور علی خاں صاحب نے بایں الفاظ فرمایا ہے، کہ

"عید الاضحٰی میں مولٰنا (نانوتوی) کا دستور تھا کہ سالم گائے کی قربانی کیا کرتے، صبح کے وقت میں حاضر تھا، منشی محمد لیسین صاحب مولٰنا صاحب کے ماموں زاد بھائی تشریف

لائے اور عرض کیا کہ گائے کی قیمت سات روپے ٹھہر گئی ہے۔"

لکھتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت والا نے فرمایا کہ "اچھا" منشی محمد یٰسین صاحب اس کے بعد چلے گئے، مولانا منصور علی خاں کہتے ہیں کہ ان کے جانے کے بعد

"ایک گھنٹہ میں ایک مسافر آدمی، جو غریب مسکین معلوم ہوتا تھا آیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ کر جیب میں سے کچھ روپے نکال کر مولانا صاحب کی نذر کئے۔"

اب آگے سنئے۔ یہ مولوی منصور علی خاں کی چشم دید شہادت ہے وہ فرماتے ہیں کہ

"مولانا صاحب (مولانا نانوتوی) وہ روپے مجھ کو دیئے کہ منشی محمد یٰسین کو دے دو۔"

روپے مولوی صاحب نے لے لئے کر اُن کو گنا، کہتے ہیں،

"کہ میں نے دیکھا تو سات ہی روپے تھے، حیران رہ گیا کہ خداوندا یہ کیا اسرار اور رازونیاز ہے۔"

ظاہر ہے کہ بساط قرب کے حاشیہ نشینوں کے سوا اس قسم کی جزئیات سے آگاہی کی عوام کے لئے شکل ہی کیا تھی، اور سوانح مخطوطہ کے مصنف بھی چونکہ ان ہی خوش نصیبوں میں تھے، جنھیں قرب و نزدیکی کی یہ نعمت میسر تھی، معلوم ہوتا ہے کہ صبح و شام، رات، دن اس نوعیت کی چیزوں کے مشاہدہ و تجربہ کے مواقع ملتے رہتے تھے، ورنہ عمومیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی وہی بات صحیح ہے کہ کنوئیں کی تہ میں پانی چھپا رہتا ہے حضرت والا اپنی "ولایت" کے آثار و ثمرات کو چھپاتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرد و پیش میں رہنے والوں کے سامنے بھی کوئی بات کسی شدید ضرورت ہی کے وقت ظاہر ہو جاتی تھی، مولوی منصور علی خاں صاحب ہی نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اپنی ذاتی مصیبتوں، اپنے اقرباء کی تکلیفوں کے ازالہ میں باطنی قوت سے کام لینے کی نظیریں جس کی زندگی میں نہیں ملتیں یا بہت کم ملتی ہیں، اپنے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت مولانا گنگوہی کی گرفتاری اور جیل و حبس کی سزا میں بھی جسے راضی برضا پایا گیا تھا، اسی کے متعلق سنئے مولانا منصور علی خاں کسی دوسرے سے سنی ہوئی نہیں اپنی چشم دید روئت کی یہ روایت سناتے ہیں۔

"ایک بار (نانوتہ واپس ہوتے ہوئے)، سفر میں میں بھی ہمراہِ رکاب تھا، واپسی میں جب

نانوتہ ایک میل رہا مولٰنا صاحب کا حجام نانوتہ سے آتا ہوا ملا' دریافت فرمایا تو عرض
کیا کہ میں آپ ہی کے پاس جاتا تھا' فرمایا کیوں؟"
اب یہی سننے کی بات ہے' حجام قصہ سنانے لگا کہ
"تھانہ دار نانوتہ نے ایک عورت کے بھگانے کا جرم مجھ پر لگا کر چالان کا حکم دیا
ہے' میں بالکل بے خطا ہوں' خدا کے واسطے مجھے بچایئے"۔
اللہ اللہ جس کے سامنے خدا جانے کتنے بڑے بڑے امیر' اور کتنے علماء و فضلاء اعزہ و اقرباء
غدر کے زمانہ میں چالان کئے گئے' اور پھانسی' یا عبور دریائے شور کی سزاؤں کے مستحق قرار
دئے گئے' خود اس پر بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا' وارنٹ حکومت کی طرف سے جاری ہوا'
اور برسوں جاری رہا' لیکن ان سارے واقعات میں ایک عامی مسلمان کی طرح جو ادل سے آخر
تک دم بخود ہو کر دیکھتا رہا' آج اسی کے سامنے اس کے گاؤں کا حجام کھڑا ہے' اور کہتا ہے کہ
"میں بالکل بے خطا ہوں' خدا کے واسطے مجھے بچایئے"
مولٰنا منصور علی خاں ہی کی زبانی سنئے' کہ ایک ایسے ساکن بحر محیط میں حجام کے اس طرز بیان
نے کس قسم کا تلاطم پیدا کر دیا۔ وہی رقمطراز ہیں کہ
"جس وقت مسجد نانوتہ پہونچے' بیٹھتے ہی' مجھ سے فرمایا کہ منشی محمد یٰسین کو بلا لاؤ"
جانتے ہیں نانوتہ کی مسجد میں بیٹھکر' گھر جانے سے بھی پیشتر اپنے خاص کارپرداز منشی محمد یٰسین کی طلبی
کس کام کے لئے ہوتی ہے؟ مولوی منصور علی خاں صاحب یہ بیان کرکے کہ حسب ارشاد منشی
محمد یٰسین صاحب کو میں بلا کر لے آیا' وہ حضرت والا کے سامنے کھڑے تھے' اور مولوی منصور علیخاں
صاحب کے کان میں جلال و ہیبت میں ملی ہوئی آواز آرہی تھی خود وہی فرماتے ہیں کہ
"ان سے (منشی محمد یٰسین سے) عجب شان جلالی سے فرمایا کہ اس غریب (حجام) کو تھانہ دار
نے بے قصور پکڑا ہے' تم اس سے (تھانہ دار سے) کہدو کہ یہ (حجام) ہمارا آدمی ہے
اس کو چھوڑ دو' ورنہ تم بھی نہ بچو گے"۔

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، اسی کے ساتھ سنایہ گیا کہ خلاف دستور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ
"اس کے (حجام کے) ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالوگے تو تمہارے ہاتھ میں بھی ہتھکڑی پڑے گی" صـ ۱۸۱

منشی محمد لیسین مرحوم اس رنگ کو دیکھ کر دنگ ہو کر رہ گئے، الٹے پاؤں تھانہ دار صاحب کے پاس پہونچے، اور بقول مولانا منصور علی خاں مرحوم،

"تھانہ دار کے پاس جاکر مولانا صاحب کا ارشاد ہو بہو کہلایا"

مگر تھانہ دار اپنا ہاتھ کاٹ چکا تھا، تھانہ کے روزنامچہ میں مجرم پر جرم کا الزام عائد کر کے اپنے اختیار تمیزی کی قوت ختم کر چکا تھا، گھبرا کر منشی محمد لیسین صاحب سے تھانہ دار نے کہا کہ

"اب کیا ہوسکتا ہے روزنامچہ میں اس کا (حجام) کا نام لکھدیا گیا ہے"

تھانہ دار بے چارا خیال کرتا تھا کہ مولانا کا حکم اس کے اختیاری حدود تک محدود ہے، مگر منشی محمد لیسین صاحب کو دیکھا کہ پھر واپس چلے آرہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں، کہ حضرت کا حکم ہے کہ تھانیدار سے

"جاکر کہدو، کہ اس کا نام روزنامچے سے نکال دو"

مغلی نہیں، بلکہ برطانوی طرز حکومت کے تھانہ میں یہ تصرف کہ روزنامچہ میں درج ہونے کے بعد مجرم کا نام کاٹ دیا جائے ظاہر ہے کہ خود جرم اور بدترین جرم تھا، تھانہ دار سخت حیران تھا، منشی محمد لیسین صاحب نے جب روزنامچے سے نام کاٹ دینے کی فرمائش مولانا کی طرف سے پیش کی تو تھانہ دار نے کہا کہ

"نام لکھا ہوا کاٹنا بڑا جرم ہے"

اور بات پوری بھی کرنے نہ پایا تھا کہ عالم سراسیمگی میں منشی محمد لیسین صاحب سے کہا کہ

"چلو میں بھی مولانا صاحب کے پاس تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

ہانپتے کانپتے، حالت اضطراب میں حضرت والا کے پاس مسجد ہی میں تھانہ دار حاضر ہوا، اور بے کسی کے ساتھ جیسا کہ مولانا منصور علی خاں نے لکھا ہے حضرت کی خدمت میں عرض کر رہا تھا کہ

"حضرت نام نکالنا بڑا جرم ہے"

اور کیسا جرم؟ اسی نے بیان کیا کہ

"اگر نام اس کا (حجام) کا نکالا میری نوکری جاتی رہیگی"

ظاہر ہے چارج شیٹ قائم کرنے کے بعد اس قسم کے مجرمانہ تصرف کا یہی نتیجہ تصرف کرنے والے کے سامنے قانوناً آسکتا تھا، اس سے حضرت والا بھی ناواقف نہ تھے، مگر آج رنگ ہی دوسرا تھا، تھانہ دار تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اس جرم کے بعد میری نوکری جاتی رہے گی، لیکن تھانہ داروں یا سرکاری ملازموں کے عزل و نصب کا اختیار جن ہاتھوں میں لوگوں کو نظر آتا ہے، کیا واقعی یہ اختیار ان ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، آج قوانین عالم کا ایک شارح اس کی شرح اپنے ان الفاظ میں تھانہ دار کے آگے کر رہا تھا، کہ

"اس کا (حجام) کا نام (روزنامچہ) کاٹ دو، تمہاری نوکری نہیں جائے گی"

کسی ادنیٰ چپراسی یا گاؤں کے چوکیدار کے تقرر یا برطرفی کا اختیار بھی بظاہر جس کے ہاتھ میں نظر نہیں آتا تھا وہ پولیس کے ایک افسر کو اطمینان دلا رہا ہے کہ نوکری نہیں جائے گی، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس افسر ہی کی نہیں بلکہ حکومت کی مطلق "نوکری" بھی صرف اس کی منشاء کی تابع ہے، مولانا منصور علی خاں صاحب بھی موجود تھے اس وقت ان کے جو احساسات تھے ان کا اظہار، ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

"اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولانا صاحب فرما رہے ہیں ایسا ہی ہوگا"

واللہ اعلم ان کو کیا معلوم ہو رہا تھا، آگے اسی کے بعد وہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"جس نے وہ حالت دیکھی ہے، اس کے یقین میں (یعنی جو کچھ کہا جا رہا ہے یہی ہو کر رہیگا) ذرا بھی شک نہیں تھا"

کیا فکنت[1] بصرہ الذی یبصر بہ و سمعہ الذی یسمع بہ و یدہ التی یبطش بھا و رجلہ التی

[1] بخاری وغیرہ کے الفاظ ہیں کہ بندہ جب اپنے خالق کا محبوب بن جاتا ہے تو ارشاد ربانی ہے کہ میں اسکی بینائی ہو جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے اس کی شنوائی ہو جاتا ہوں جس سے سنتا ہے، اسکے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے پکڑتا ہے، اس کے پاؤں ہو جاتا ہوں جن سے چلتا ہے، قرآن میں "ناصیۃ" کے عمل کا صلہ "ھو خیط" جو فرمایا گیا ہے شاید اسی کی یہ شرح ہے ۱۲

مفصل داستان تو ارواح ثلاثہ میں پڑھئے، حاصل یہ ہے کہ "در ہنگام نوجوانی چنانچہ افتد دانی" کے شکار کسی طرح سے اسی زمانہ میں حکیم صاحب یعنی مولٰنا منصور علی خاں صاحب بھی ہو گئے تھے، جب سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، حالت روز بروز بد سے بدتر ہونے لگی، استاد نے افتاد کا اندازہ کر لیا، پہلے تو کچھ عقلی تدبیروں سے کام لیا گیا، اور آخر میں جیسا کہ حافظ صاحب مرحوم سے بعد کو مولٰنا منصور علی خاں نے خود بھی بیان کیا کہ مغرب کی نماز کے بعد حکم دیا گیا کہ چھتہ کی مسجد میں حاضر ہوں، صلوٰۃ الاوابین سے فارغ ہو کر مولوی صاحب کہتے تھے کہ میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا، جیسے بان بٹے جاتے ہیں، آگے مولٰنا منصور علی خاں کے بجنسہٖ الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں کہ

"خدا کی قسم میں نے بالکل عیاناً دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں، اور ہر چہار طرف سے نور اور روشنی نے میرا احاطہ کر لیا ہے، گویا میں دربار الٰہی میں حاضر ہوں، میں اس وقت لرزاں اور ترساں تھا کہ ساری عمر مجھ پر یہ کیفیت اور یہ خوف طاری نہوا تھا، میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور بالکل خودی سے گذر گیا" (ارواح ص۱۸۱)

فرماتے تھے کہ میں تو اس حال میں مستغرق تھا اور حضرت والا برابر میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی پھیر رہے تھے، جب ہتھیلی پھیرنے کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو مولٰنا منصور علی خاں کا بیان ہے کہ "مکاشفہ کی جو حالت ان پر طاری ہوئی تھی وہ حالت جاتی رہی، اور حکم دیا گیا کہ جاؤ، پھر کیا ہوا خود کہا کرتے تھے۔ دو دن بعد پوچھا گیا تھا بولے کہ جس کے لئے اتنی بے کلی اور بے چینی تھی اس کے تصور کی بھی قلب میں گنجائش باقی نہ رہی فرمایا گیا کہ

"اللہ کا شکر کرو" ص۱۸۱

اور یہ روایت تو بالواسطہ ہم تک پہونچی ہے، اپنی کتاب "مذہب منصور" میں مولٰنا منصور علیخاں نے "اپنی آپ بیتی" حکایت خود بھی درج کی ہے، واللہ اعلم یہ واقعہ اس "چنانکہ افتد دانی" سے پہلے کا ہے یا بعد کا، بہر حال قصہ یہ ہے، لکھا ہے کہ

ماہ بماہ بھیجا جائے گا، کسی ایسے طالب العلم کو دیا جائے، جو قانوناً مدرسہ کی امداد کا مستحق نہ ہو کوپن کی اس عبارت کے ساتھ ہی جیسا کہ چاہئے تھا، حضرت شیخ الہند کا خیال اسی قابل رحم طالب العلم کی طرف منتقل ہوگیا، اسی وقت یاد فرمایا گیا، اور بشارت سنائی گئی کہ لو تمہارے طعام کا نظم اللہ میاں کی طرف سے ہوگیا، وظیفہ جاری کر دیا گیا، اور اس کی جو آرزو تھی، دورہ میں شریک ہوکر حدیث سن لی، تعلیمی مدت کے اختتام پر وہ مدرسہ سے چلا گیا، حضرت شیخ الہند فرماتے تھے کہ چند سال گذر گئے، پھر اس طالب العلم کی کوئی خبر نہ ملی، بلکہ اس کا خیال بھی دماغ سے نکل گیا، اچانک کئی سال بعد دیکھتا ہوں کہ وہی طالب العلم آیا ہوا ہے، تعارف کرایا کہ وہی طالب العلم ہوں جو قانوناً مدرسہ کی امداد کا مستحق نہ تھا، حضرت نے پوچھا کہ اس عرصے میں تم کہاں رہے، یہی قصہ اب سننے کا ہے جو اس نے بیان کیا، کہنے لگا کہ حضرت سے رخصت ہوکر غالباً وہ پنجاب کی طرف کسی علاقہ میں چلا گیا، اور کسی قصبہ کی مسجد میں لوگوں نے ان کو امام کی جگہ دے دی، قصبہ والے ان سے کافی مانوس ہوگئے، اور اچھی گذر بسر ہونے لگی اسی عرصہ میں کوئی مولوی صاحب گشت کرتے ہوئے اس قصبہ میں بھی آدھمکے، وعظ و تقریر کا سلسلہ شروع کیا، لوگ ان کے کچھ معتقد ہوئے، انھوں نے دریافت کیا کہ یہاں کی مسجد کا امام کون ہے، کہا گیا کہ دیوبند کے پڑھے ہوئے ایک مولوی صاحب ہیں، دیوبند کا نام سننا تھا کہ واعظ مولانا صاحب آگ بگولا ہوگئے، اور فتوے دے دیا کہ اس عرصے میں جتنی نمازیں اس دیوبندی کے پیچھے تم لوگوں نے پڑھی ہیں، وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوئیں، اور جیسا کہ دستور ہے، دیوبندی یہ ہیں، وہ ہیں، یہ کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں، اسلام کے دشمن ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

قصباتی مسلمان بے چارے سخت حیران ہوئے کہ مفت میں اس مولوی پر روپے بھی برباد ہوئے اور نمازیں بھی برباد ہوئیں، ایک وفد اس غریب دیوبندی امام کے پاس پہونچا۔ اور مستدعی ہوا کہ مولانا واعظ صاحب جو ہمارے قصبہ میں آئے ہیں، ان کے جو الزامات ہیں

پائوں کا جواب دیجئے ورنہ پھر بتائیے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ کیا کریں، جان بھی غریب کی خطرے میں آگئی اور نوکری دوکری کا قصہ تو ختم شدہ ہی معلوم ہونے لگا چونکہ علمی مواد بھی ان کا معمولی تھا خوف زدہ ہوئے کہ خدا جانے یہ واعظ مولٰنا صاحب کس پائے کے عالم ہیں، منطق و فلسفہ بگھاریں گے۔ اور میں غریب اپنا سیدھا سادہ ملا ہوں، ان سے بازی لے بھی جاسکتا ہوں یا نہیں، تاہم چارہ کار اسکے سوا اور کیا تھا، کہ مناظرہ کا وعدہ ڈرتے ڈرتے کر لیا، تاریخ اور محل و مقام سب کا مسئلہ طے ہو گیا واعظ مولٰنا صاحب بڑا از بردست عمامہ طویلہ و عریضہ سر پر لپیٹے ہوئے کتابوں کے پشتارے کے ساتھ مجلس میں اپنے حواریوں کے ساتھ جلوہ فرما ہوئے، ادھر یہ غریب دیوبندی امام منحنی و ضعیف مسکین شکل مسکین آواز، خوف زدہ، لرزاں و ترساں بھی اللہ اللہ کرتے ہوئے سامنے آیا، سننے کی بات یہی ہے جو اس کے بعد اس دیوبندی امام مولوی نے مشاہدہ کے بعد بیان کی، کہتے تھے کہ مولٰنا واعظ صاحب کے سامنے میں بھی بیٹھ گیا، ابھی گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اپنے بازو میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک شخص اور جسے میں نہیں پہچانتا تھا وہ بھی آکر بیٹھ گیا ہے، اور مجھ سے وہ اجنبی اچانک نمودار ہونے والی شخصیت کہتی ہے کہ ہاں! گفتگو شروع کرو، اور ہرگز نہ ڈرو، دل میں غیر معمولی قوت اس سے پیدا ہوئی، اس کے بعد کیا ہوا، دیوبندی امام صاحب کا بیان ہے کہ میری زبان سے کچھ فقرے نکل رہے تھے اور اس طور پر نکل رہے تھے کہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں، جس کا جواب مولٰنا واعظ صاحب نے ابتدا میں تو دیا، لیکن سوال و جواب کا سلسلہ ابھی زیادہ دراز بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دفعہ مولٰنا واعظ صاحب کو دیکھتا ہوں کہ اٹھ کھڑے ہوئے میرے قدموں پر سر ڈالے ہوئے رو رہے ہیں، پگڑی بکھری ہوئی ہے، اور کہتے جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہیں، للہ معاف کیجئے۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں یہی صحیح اور درست ہے، میں ہی غلطی پر تھا؛ یہ منظر ہی ایسا تھا کہ مجمع دم بخود تھا، کیا سوچ کر آیا تھا اور کیا دیکھ رہا تھا۔ دیوبندی امام صاحب نے کہا کہ اچانک نمودار ہونے والی شخصیت میری نظر سے اس کے بعد اوجھل ہو گئی اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون تھے اور یہ قصہ کیا تھا؛

قصہ تو ختم ہوگیا۔ قصبہ کے مسلمان جو پہلے ہی سے دیوبندی امام صاحب کے معتقد تھے ان کی عقیدتمندیوں میں اس واقعہ نے چار چاند لگا دیئے، اور پہلے سے بھی زیادہ راحت و آرام میں دیوبندی امام صاحب کے اضافہ ہوگیا۔

حضرت شیخ الہند فرماتے تھے، میں نے ان مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ اچانک نمودار ہو کر غائب ہو جانے والی شخصیت کا حلیہ کیا تھا، حلیہ جو بیان کیا فرماتے تھے کہ سنتا جاتا تھا اور حضرت الاستاذ کا ایک ایک خال و خط نظر کے سامنے آتا چلا جا رہا تھا، جب وہ بیان ختم کر چکے تو میں نے ان سے کہا کہ یہ تو حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جو تمہاری امداد کے لئے[1] حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئے۔

---

[1] جو نہیں جانتے ہیں وہ تو خیر جاہل ہیں لیکن جان کر بھی علماء دیوبند کے متعلق بہتان تراشیوں اور تہمت بافیوں کی خدمت جو انجام دے رہے ہیں ان کو اپنے اعمال کا محاسبہ اسی کے سامنے دینا ہوگا جس کے سامنے دنیا ان کی چلے گی اور نہ تو یا پیترے کام آئیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلہ میں علماء دیوبند کا خیال بھی وہی ہے جو عام اہل السنت والجماعت کا ہے، آخر جب ملائکہ جیسی روحانی ہستیوں کے خود قرآن ہی میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی امداد کراتے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ واقعہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تخفیف صلوات کے مسئلہ میں امداد ملی، اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں بشارتیں ملیں، تو اس قسم کی ارواح طیبہ سے کسی مصیبت زدہ مومن کی امداد کا کام قدرت اگر لے تو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے اس کی تردید ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ آدمی کو عام طور پر جو امداد بھی مل رہی ہے، حق تعالیٰ اپنی مخلوقات ہی سے تو یہ امدادیں پہنچا رہے ہیں، روشنی آفتاب سے ملتی ہے، دودھ ہمیں گائے اور بھینس سے ملتا ہے، یہ تو ایک واقعہ ہے بھلا یہ بھی انکار کرنے کی کوئی چیز ہو سکتی ہے، ہاں! سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کے امدادی پہلوؤں سے استفادہ یا ان کے نقصان رساں پہلوؤں سے بچنے کی قدرتی راہ کیا ہے، مشرک قوموں کا طریقہ کار یہ ہے کہ بجائے امداد پہنچانے والی حقیقی قوت کے امداد کے ان ذرائع اور وسائط ہی کو پوجنے لگتی ہیں، مثلاً روشنی کے لئے آفتاب کو پوجتی ہیں یا زہر سے بچنے کے لئے سانپ کو پوجتی ہیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نفع ہو یا نقصان خواہ بلا واسطہ پہنچے یا بالواسطہ ہر حال میں سب کو اسی کی طرف سے سمجھتے ہیں، جو ان ذرائع اور وسائط سے نفع اور نقصان کی صورتوں کو پیدا کر رہا ہے۔ ہم دودھ کے لئے بھینس یا گائے کو نہیں پوجتے بلکہ اس کو پوجتے ہیں، اس سے مانگتے ہیں جو گوشت کی ان تھیلیوں میں دودھ پیدا کرتا ہے بس۔ بزرگوں کی ارواح سے مدد لینے کے ہم منکر نہیں ہیں بلکہ اس امداد کے لئے بزرگوں کی یا ان کی قبروں کی ان کے آثار کی عبادت کو شرک یقینی کرتے ہیں۔ موحد اور مشرک کے نقطۂ نظر میں یہی جوہری فرق ہے دیکھئے صفحہ آئندہ

مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے جو واقف ہیں اس کتاب میں بھی مختلف حیثیتوں سے ان کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ ان کی جلالت قدر کے لئے یہی کافی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ ان ہی کے مرید اور خلیفہ خاص تھے۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ ان ہی نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کا ذاتی تجربہ سیدنا الامام الکبیر کے متعلق امیر شاہ خاں بایں الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

"نواب مصطفیٰ خاں کی یہ عادت تھی کہ ہمارے اکابر خانوادہ ولی اللّٰہی میں سے جب کوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فوراً مراقب ہو کر ان کی نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت نانوتوی ان سے ملنے تشریف لے گئے، اور نواب صاحب حسب عادت مراقب ہوئے۔ سر اٹھایا تو ایک صاحب موجان زامی سے خطاب فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے، لیکن مولانا کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے۔" ص ۲۷

"بڑے بڑے لوگ دیکھے" نواب صاحب کے ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان بڑوں کی باطنی نسبت کا پتہ بآسانی چلالیتے تھے لیکن سیدنا الامام الکبیر نے اخفائی قوتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے، اس موقعہ پر کام لیا کہ نواب صاحب جیسی ہستی بھی اس کا ٹوہ نہ لگا سکی، عوام سے اخفاء وستر کا مسئلہ دشوار نہیں ہے، لیکن بقول شخصے دائی سے بھی پیٹ کے چھپانے میں کامیاب ہونا بجائے خود میرے نزدیک مستقل کرامت اور بڑا کمال ہے۔

اسی طرح مصلحۃً اخفاء کمال کی کوشش کبھی کبھی ضرورۃً ترک بھی ہو جاتی تھی یا کوشش کی شدت کم ہو جاتی تھی، میرٹھ کا ایک قصہ مشہور ہی ہے، ہمارے مصنف امام نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور ارواح ثلاثہ میں بھی یہ روایت مولانا حبیب الرحمن مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی طرف منسوب کی گئی ہے، حاصل یہ ہے کہ مثنوی رومی کا درس شروع فرما دیا تھا، حلقہ درس میں اتفاقاً ایک دن ایک صاحب حال و نسبت آدمی بھی شریک ہو گئے، مثنوی شریف سے

نہ فرماتے تھے" ص۳۶

اور یہی وہ بات ہے جس کا دعویٰ شروع ہی سے کرتا چلا آرہا ہوں؛

بہر حال میں بیان یہ کر رہا تھا کہ مولنا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد کوچہ چیلان والے مکان کے کوٹھے پر جن حالات میں سیدنا الامام الکبیر کو پایا گیا تھا، اور خالی ہو جانے کے بعد ہو کے اسی مکان میں آپ کی آمد و رفت خاص طریقہ سے جو جاری رہی، یہی وہ زمانہ معلوم ہوتا ہے جس میں ذہنی و دماغی علوم سے فارغ ہونے کے بعد قلب و روح سے تعلق رکھنے والے تجربات و مشاہدات میں آپ مستغرق ہوئے، اور آپ کی فطری صلاحیت و استعداد نے بہت جلد اس راہ کے نتائج و ثمرات کی یافت میں آپ کو کامیابی عطا فرما دی اور حقیقی اقتضا، آپ کی فطرت کا اگرچہ وہی تھا جسے مختلف بزرگوں کے حوالے سے نقل کر چکا ہوں یعنی فرمایا کرتے تھے کہ

"ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا" ص الہادی ماہ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ

لیکن حالات و واقعات ہی ایسے تھے کہ آپ کو بھی دنیا کے سامنے آنا پڑا، اور دنیا بھی آپ کے سامنے آئی لیکن اس میں بھی کوشش آپ کی جہاں تک معلوم ہوتا ہے یہی رہتی تھی کہ جاننے والے اگر جانیں بھی تو صرف یہی جانیں کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کے مولوی ہونے کے سوا آپ اور کچھ نہیں ہیں اسی سلسلہ میں امیر شاہ خاں صاحب مرحوم ایک قصہ بھی سنایا کرتے تھے، قصہ تو طویل ہے، ارواح ثلاثہ میں تفصیل کو پڑھ لیجئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خورجہ میں ایک دفعہ کسی نے ایک خوش گلو آدمی کو مجلس مبارک میں لا کر چاہا کہ حافظ کی مشہور غزل

غلام نرگس مست تو تاجدارانند

کے مطلع والی سنوائیں، حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الاپنا شروع کیا؛ مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہونچی تھی کہ بے چارا گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا کہ

"آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے"[۱]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

چونکہ خواہش بھی یہی تھی، کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو، معلوم ہوا تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی، تو جن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی، نام ان کا عبداللہ خاں تھا گلاوٹھی کے رہنے والے تھے ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں اور چین بجبیں ہو کر فرما رہے ہیں کہ

"میرا ایما معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی"

اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ

"میں جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں، اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے" ص۱۷۶

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہور میں بھی بجائے صوفیوں کے رعایت زیادہ تر آپ اپنے اسی پہلو کی فرماتے تھے، جس کا نام آپنے "علم کا دھبہ" رکھ چھوڑا تھا" اس موقعہ پر امیر شاہ خاں نے حضرت والا کے ان الفاظ کو بھی دہرایا ہے کہ ان ہی مولوی عبداللہ سے یہ بھی کہا کہ

"اگر مولویت کی قید نہ ہوتی، تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کے گھونسلا بھی ہوتا ہے، میرے لئے یہ بھی نہ ہوتا، اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا" ص۱۷۷

لیکن چھپانے والے نے لاکھ چھپانے کی کوشش کی ہو، مگر ہر چھپی ڈھکی بات کا جو جاننے والا ہو وہ اس کے چھپنے پر راضی بھی تو ہو؟ مولٰنا منصور علی خاں حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں، اس ناسوتی زندگی، اور خاکی قالب سے انقطاع کی آخری گھڑیوں میں وہ بھی موجود تھے، ان کے کانوں کی سنی ہوئی یہ گواہی ہے کہ

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۹۱)

لے امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا، جواب میں کہا کہ بھائی جب گانے میں آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھدی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا ۱۲

(ص۱۷۵ ارواح ثلاثہ)

بجز خرق عادت کے اور کیا ہو سکتا ہے، اپنی زندگی کے اس پہلو کو آپ نے خود کھولا نہیں تھا بلکہ کھولنے والے نے کھول دیا تھا کہ دوسروں نے زیادہ سے زیادہ جسے لڑکوں کا پڑھانے والا یا عظ کہنے والا، کچھ کتابیں لکھنے والا ملّا یا مولوی سمجھ رکھا تھا، درحقیقت اپنے مالک کا کتنا راستباز، بلکہ سچ کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ کتنا بڑا عشق باز محرم راز اور وفادار بندہ تھا۔

اور یہ باتیں جنکا ذکر اب تک کیا گیا، ان کا تعلق بجائے علم کے اگر آپ غور کریں گے، تو زیادہ تر عمل سے نظر آئیگا، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خرق عوائد یا عام اصطلاح میں "کرامت" کے لفظ سے جس کی تعبیر کی جاتی ہے، بضرورت اس کا ظہور اگر ہوا بھی، تو اس کا تعلق کسی عمل اور کام سے تھا، لیکن قرآنی نصوص واتقوا اللّٰہ ویعلمکم اللّٰہ (ڈرو اللہ سے اور تمہیں سکھانے لگے گا) یا ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقانا (ڈرو اللہ سے اللہ تم کو فرقان عطا کرے گا) یعنی حق و باطل، خطا و ثواب میں امتیاز کا سلیقہ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے والوں کو عطا کیا جاتا ہے، یا ارشاد ہوا ہے کہ المحسنین (احسان کا طریقہ دین میں اختیار کرتے ہیں) ان کو حکم یعنی وہی فرقانی ملکہ حق کو باطل سے جدا کرنے کا سلیقہ ارزانی فرمایا جاتا ہے اور علم عطا کیا جاتا ہے[۱]۔ الغرض مدرسہ کے بعد کوچہ چیلاں کے "ھو" والے مکان کی محنتوں یا دربار الٰہی کے دوام حضور کے سلسلے میں کیا کچھ ملا۔ اس کا حال تو یہ ہے کہ نہ جاننے والے تو شاید وہی سمجھتے ہوں جیسے میرٹھ کے صاحبدل بزرگ نے تجربہ سے پہلے خیال کیا تھا، کہ

"یہ اثر تجر علمی کا ہے" ص۱۶

مگر جو حضرت والا کے صحیح حالات اور زندگی کے مشاغل سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ "تجر علمی" کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان سے آپ کا تعلق کیا تھا، ابتدا میں اس کا کچھ تذکرہ کر چکا ہوں حضرت تھانوی کی شہادت نقل کر چکا ہوں کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں"۔ الہادی ماہ جمادی الثانی ص۵

[۱] سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے فلما بلغ اشدہ آتیناہ حکما و علما وکذلک نجزی المحسنین (جب وہ قوت کی آخری حد تک پہونچے تو ہم نے ان کو یعنی یوسف کو حکم اور علم عطا کیا اور یوں ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم محسنین کو یعنی احسانی زندگی بسر کرنے والوں کو) اسی قرآنی کلیہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے

ان ہی کے حوالہ سے اسی کتاب میں یہ روایت بھی درج کی گئی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے ایک دفعہ یہ عرض کیا گیا کہ

"جب آپ سے کوئی کسی بات کا سوال کرتا ہے، تو آپ برجستہ فرما دیتے ہیں کہ اس کے تین جواب ہیں، یا پانچ جواب ہیں"

پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ

آپ نے کیا پہلے سے سوالوں کے جوابات سوچ کر ان کی فہرست لگا رکھی ہے یا آپ سوچ کر آتے ہیں؟

جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ

"نہیں بلا اختیار میری زبان سے یوں ہی نکل جاتا ہے، اور اتنے ہی جواب دیکر میری طبیعت رک جاتی ہے" ص ۱۹۵

فکر و نظر، تعقل و ذہانت کے زور سے پیدا ہونے والے نتیجے اور علم و دانش، فرقان و امتیاز کے جو سوتے تقویٰ کی راہوں سے مومن کے اندر پھوٹ پڑتے ہیں، کچھ اسی قسم کے خصوصی آثار سے دونوں کے باہمی فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس قسم کی تجربی حقیقتوں کا عام کلیہ وہی "من لم یذق لم یدر" کی عربی ضرب المثل ہی ہو سکتی ہے، یعنی جس نے چکھا نہیں وہ ان سے واقف بھی نہیں ہو سکتا،

کور مادرزاد کو کیسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ رنگ کیا چیز ہے، یا روشنی کس حقیقت کی تعبیر ہے، آخر آپ ہی بتائیے ارواح ثلاثہ میں ہمارے مصنف امام حضرت مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ بیان جو منسوب کیا گیا ہے، کہ چھتہ کی مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے، اسی مجمع میں ایک دن فرمانے لگے

"بھائی! آج تو صبح کی نماز میں ہم مرجاتے، بس کچھ ہی کسر رہ گئی"

لوگ حیرت سے پوچھنے لگے کہ آخر کیا حادثہ پیش آیا، سننے کی بات یہی ہے، جواب میں فرما رہے تھے

"آج صبح میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا، کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گذرا کہ میں تحمل نہ کر سکا، اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے"

کہتے تھے کہ وہ تو خیر گذری کہ

"وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا تھا، ویسا ہی نکلا چلا گیا، اس لئے میں بچ گیا"

کہتے تھے کہ علوم کا یہ دریا جو اچانک چڑھتا ہوا ان کے قلب پر سے گذر گیا۔ یہ کیا تھا، خود ہی اس کی تشریح بھی ان ہی سے بایں الفاظ اسی کتاب میں پائی جاتی ہے،

"نماز کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا، تو منکشف ہوا کہ حضرت مولٰنا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے، یہ ان کی توجہ کا اثر ہے، کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں اور تحمل دشوار ہو جائے" ص۲۰۱

خود ہی بتائیے کہ فکری و دماغی علوم والے بھلا اس کا کیا مطلب سمجھ سکتے ہیں، کہاں میرٹھ اور کہاں چھتہ کی مسجد میرٹھ سے دیوبند تک کا مکانی فاصلہ درمیان میں حائل نہ ہوا، اور توجہ دینے والا اپنے علوم کا دباؤ دوسرے قبول کرنے والے قلب پر ڈال رہا تھا، مجھ جیسے بے بصیرتوں کی سمجھ میں اسکی توجہ بھلا کیا آئے وہ کیا بتائے کہ یہ دریا کیا تھا، کس راہ سے آیا اور کس راہ سے گذر گیا۔

ہاں! جس کے دل کے اندر سے یہ دریا گذرا تھا ان ہی کے حوالہ سے اسی کے بعد یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں، حضرت نانوتوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولٰنا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ

"اس کے قلب کی وسعت کا کیا حال ہوگا، جس میں وہ علوم سمائے ہوئے ہیں، اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کئے ہوئے ہوگا" ص۲۰۱ ارواح

حالانکہ خود مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے علوم کا سرچشمہ بھی جہاں تک ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے، تقویٰ کی زندگی ہی تھا، اسی لئے میرٹھ کی دی ہوئی توجہ کے اثر کو دیوبند کی مسجد میں ان کے قلب نے محسوس کر لیا، کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کی آنکھ میں بینائی ہوگی وہی تو روشنی کو محسوس کر سکتا ہے، ورنہ اندھوں کے لئے روشنی کا وجود و عدم دونوں برابر ہے، بہر حال کچھ بھی ہو تھے وہ بھی مرد اسی راہ کے خود چکھے ہوئے تھے، اسی لئے جانتے تھے، اور اس کی قدر پہچانتے تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے مصنف امام کے تلمیذ رشید ہیں، اسی سلسلہ کا ایک قصہ نقل بھی کیا کرتے

آخر میں اسی کے بعد فرماتے ہیں۔

"آخر سب کو خاک ہی میں ملا دیا، اپنا کہنا کر دکھلایا" صـ۳۱

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ظاہر و باطن، دماغ و دل، مدرسہ اور خانقاہ کے اکتسابی کمالات و فضائل سیدنا الامام الکبیر کی خداداد فطری صلاحیتوں، اور جبلی ملکات کے ساتھ اس عہد میں جس خاص طریقہ سے ایک شخصی وجود میں سمٹ کر جمع ہو گئے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اپنے عہد میں اس عجیب وغریب "جامعیت" کی وہ اپنی آپ نظیر تھے خود ان کے پیر و مرشد جو اس زمانہ کے ہندی علماء کے گویا تقریباً شیخ الکل تھے، جب وہی یہ فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ ہمارے مصنف امام نے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

"خود احقر (مصنف امام) سے حاجی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا تھا، اول حج میں جب حاضر خدمت ہوا تھا"

ان کی یہ شہادت اپنی کتاب میں سیدنا الامام الکبیر کے متعلق درج کی ہے کہ حضرت والا کا نام لے کر حاجی صاحبؒ نے کہا کہ

"ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے" صـ۱۱

اکابر دیوبند کے تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ کی طرف بہ الفاظ قصص الاکابر میں جو منسوب کئے گئے ہیں، یعنی فرماتے تھے

"اگر ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کر دیا جائے اور بتلایا نہ جاوے تو دیکھنے والے رازی و غزالی کے زمانہ کی بتلا دیں گے" صـ۱۴ الہادی ماہ جمادی الاولی

اس میں شک نہیں کہ نام تو حضرت تھانوی نے نہیں لیا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت ہی کی گویا تفسیر ہے۔ اور گو ذکر کرتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن آدمی اپنے تجربہ اور مشاہدے کا کیا کرے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ فرمایا کرتے تھے کہ

"میں نے اس کا التزام کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تصانیف دیکھ کر حضرت نانوتوی کے درس میں حاضر ہوتا اور وہ باتیں پوچھتا جو حضرت شاہ صاحب کے کتب میں مشکل ہوتی تھیں"۔

اس التزام اور دریافت کا نتیجہ کیا نکلا، شیخ الہند جیسی ذمہ دار ہستی کے الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں کہ

"شاہ صاحب کی کتاب میں جو انتہائی جواب ہوتا تھا

حضرت نانوتوی اول ہی دفعہ میں فرما دیا کرتے تھے"

اور یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی، جو ایک دو دفعہ پیش آئی ہو، اسی بیان کے آخر میں شیخ الہند ہی کے یہ الفاظ بھی درج ہیں کہ

"بارہا اس کا تجربہ کیا" (ارواح ثلاثہ ص۱۷۷)

دینی علوم کے فتوحات، وانکشافات کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان موعودہ ربانی ہدایت کے ثمرات تھے، جس کا وعدہ قرآن میں مجاہدات وریاضات کرنے والوں کو دیا گیا ہے، وہی مجاہدات وریاضت جنھوں نے حضرت والا کو "مجسم تقویٰ" بنا کر رکھ دیا تھا، لیکن اس زمانہ کے نصاب میں دینی علوم کے سوا جن فنون کی تعلیم و تعلم کا رواج تھا، سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنے والے اور سننے والے ہی بیان کرتے ہیں، کہ دوسروں سے پڑھنے کے بعد جب قاسمی حلقہ میں شریک ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا انھوں نے اب تک اس فن کے متعلق کچھ پڑھا ہی نہیں تھا، یاد پڑتا ہے، خاکسار جب بجنور اپنی نوجوانی کے عہد میں حاضر ہوا تھا، اور سیدنا الامام الکبیر سے براہ راست تلمذ کا شرف رکھنے والی ایک ہستی مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری طاب ثراہ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی تھی، تو اس وقت ان ہی سے یہ بات سنی تھی کہ مختلف علماء عصر سے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھنے کے بعد وہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، کہتے تھے کہ جو بات بھی یہاں سننے میں آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی نہیں سنی تھی، ہمارے مصنف امام نے بھی آپ کے تدریسی مشاغل کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ

تھے۔ حاصل یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی مصنف امام نے ایک نیا مضمون بیان کیا،
سننے والوں میں سے کسی نے کہا کہ اس مضمون کو تو مولانا محمد قاسم نے بھی ایک دفعہ بیان کیا تھا، سن کر
مصنف امام نے فرمایا

"جہاں سے ہم کہتے ہیں، وہاں ہی سے وہ (مولانا محمد قاسم) بھی فرماتے تھے۔"

جس کا مطلب وہی ہوا کہ سرچشمہ دونوں حضرات کے علوم کا وہی تھا، جو تقویٰ کی زندگی سے فطرت
میں پھوٹ پڑتا ہے، مگر اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

"مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا تھا، اور ہمارے لئے سوئی کے ناکے
کے برابر کھلتا ہے۔" ص ۲۹ الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۱ھ

سمندر اور سوئی کا ناکہ یہ دونوں چیزیں تو ہماری دیکھی بھالی ہیں، لیکن ان مثالوں سے باطن کی جن کیفیتوں
کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، تجربے کے بغیر خاک کسی کی سمجھ میں کچھ آسکتا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ باطن کی راہ میں پہلا قدم رکھتے ہوئے جسے ثقل کی وہ کیفیت محسوس ہوئی
ہو، جسے سن کر مرشد (حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) نے مبارک باد دیتے ہوئے یہ بشارت سنائی تھی،
پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے یعنی

"یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور سرور عالم
صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا" (ملفوظات حضرت تھانویؒ، الہادی ماہ ربیع الاول ۵۱ھ)

تو کوچہ چیلان کے "ھو" کے مکان کے مشاغل و مشاہد کے بعد کمسنی ہی میں "ولایت کبریٰ" کی دولت
سے سرفراز ہو کر وہی جب نکلے، تو اس وقت علمی جہت میں ان کے لاہوتی فتوحات کا کیا حال ہوگا،
حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ وصیت سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے ان ہی
فتوحاتی علوم و معارف کے متعلق جو نقل کی گئی ہے، یعنی آخری دفعہ سفر حج سے واپسی کے موقعہ پر
حضرت نانوتوی کے رفقاء خاص سے حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا،

"مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو، اور غنیمت جانو" ص ۳۲

ان نفلی نمازوں کو بھی ترک فرمادیا کرتے تھے، حالانکہ آپ کے شبانہ یوم کے مشاغل میں یہ نمازیں شریک تھیں اس کے راویوں میں حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں؛ اور امیر شاہ خاں کی طرف یہ روایت جو منسوب کی گئی ہے، اگر صحیح ہے، یعنی یہ کہتے ہوئے کہ

"حضرت نانوتوی کو حرام کے طعام سے جیسے نفرت تھی، ویسے ہی، اس کا احساس بھی بہت جلد کرتے تھے"

لیکن اسی کے ساتھ اپنی فطری مروت اور نرم مزاجی کی وجہ سے کسی کی خاطر شکنی بھی آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی، پھر جانتے ہیں ان دو متضاد کیفیتوں میں تطبیق کی عملی صورت کیا اختیار فرمائی جاتی تھی، مذکورہ بالا تمہید کے بعد خان صاحب بیان کیا کرتے تھے کہ

"گر دعوت بوجہ دلداری، ہر ایک کی منظور فرمالیتے تھے"

اور اس "دلداری" کے سلسلے میں جیسا کہ چاہیے تھا بعض اوقات ناجائز یا مشتبہ آمدنی رکھنے والوں کی دعوتوں میں شریک ہونے پر آپ کو مجبور ہونا پڑتا تھا۔ شریک بھی ہوتے تھے اور دعوت کرنے والے کی تسلی کے لئے کچھ تناول بھی فرمالیتے تھے، لیکن گھر پہونچ کر خان صاحب کی شہادت ہے کہ

"قے کرتے تھے" ص۲۷۱

اب ایک طرف آپ حضرت والا کی اس فطری خصوصیت کو پیش نظر رکھئے، اور اسی کے ساتھ جیسا کہ معلوم اور دستور ہے، طریقت کے شیوخ اور بیعت کے پیروں کے ساتھ لوگوں کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوتی ہے، پھر جو تعلق حضرت والا کو اپنے محبوب شیخ طریقت سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھا، شاید وہ اپنی آپ نظیر تھا، غیر معمولی احترام وعظمت سے لبریز الفاظ بے ساختہ اپنی کتابوں میں حاجی صاحب قبلہ کے متعلق جو نکل آتے ہیں، وہ آج بھی ہر ایک کے سامنے ہیں، خیر بجائے خود یہ ایک الگ مسئلہ ہے، مستقل باب ہی انشاء اللہ اس کے لئے منعقد کیا جائے گا، یہاں صرف حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان

کردہ یہ روایت مقصد کے لئے کافی ہوگی؛ قصص الاکابر میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عطا فرمودہ مسودہ کو مولٰنا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نقل کر رہے تھے

"اس میں (یعنی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارقام فرمودہ مسودہ میں) ایک لفظ سہواً غلط لکھا گیا تھا"

غلط بھی تھا' اور سہواً لکھا گیا تھا' نقل کرنے والے سے زیادہ سہو سے لکھی ہوئی اس غلطی کی تصیح کا جائز استحقاق اور کسے حاصل تھا' لیکن سہواً یہ غلطی جس کے قلم سے نکلی تھی وہ ان کے پیر و مرشد سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ کا قلم مبارک تھا' جانتے ہیں کہ سہواً لکھی ہوئی اس غلطی کے ساتھ نقل کرنے والے فاضل کو باوجود جاننے کے تصیح کی جرات نہ ہوسکی مولٰنا تھانوی فرماتے تھے کہ

"مولٰنا محمد قاسم نے صیحح نہیں کیا' ادب کی وجہ سے"

پھر کیا کیا' ان ہی کا بیان ہے کہ

"بلکہ وہاں جگہ چھوڑ دی"

اور اسی شکل میں یہ نقل کیا ہوا مبیضہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش فرما دیا گیا' اور چھوٹے ہوئے لفظ کے بارہ میں عرض کیا کہ حضرت یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا حضرت حاجی صاحب نے لفظ دیکھ کر فرمایا کہ اوہو بھائی یہ املا کی غلطی رہ گئی اور یہ کہہ کر اس لفظ کو (محمد طیب عفی عنہ نقلاً عن الشیخ مولانا حبیب الرحمٰن العثمانی رح)

"حضرت حاجی صاحب نے درست فرما دیا" (الہادی ماہ جمادی الاولی ۵۷ھ)

مگر اب سنئے اس واقعہ کو جس نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے متحیر بنا دیا تھا' اس کے راوی بھی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں، براہ راست حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر اس واقعہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے، قصص الاکابر میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ پائی جاتی ہے، حکیم الامت رح نے فرمایا کہ

"حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ مولوی محمد قاسم صاحب سے جو کچھ میں نے

تقریراً یا تحریراً کہا انھوں نے ہمیشہ خوشی سے قبول کیا۔"

بیسیوں سال کے تعلقات میں خوشی کے ساتھ ہمیشہ قبول کرنے کی اس شہادت کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا کہ

"مگر ایک دفعہ ایسا کورا جواب دیا کہ میں دیکھتا رہ گیا"

ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ کورے جواب کی جو صورت پیش آئی اسی کا تذکرہ اس وقت میرا مقصود ہے یہ کورا جواب جس فرمائش کے مقابلہ میں دیا گیا وہی سننے کا واقعہ ہے، حاجی صاحب نے فرمایا کہ ہوا یہ تھا کہ

"نواب[1] محمد علی صاحب رئیس ٹونک نے بعد معزولی مکہ معظمہ میں حرم شریف میں بخاری شریف کا ختم کرانا چاہا"

[1] ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں مرحوم کے پوتے کا نام محمد علی خاں تھا، سنا جاتا ہے کہ جسمانی کمالات کے ساتھ علوم دینی سے بھی بہرہ یاب تھے، گدی پر بیٹھنے کے بعد دماغ میں آزادی کی ہوا سمائی، ٹونک کی ایک گمنام مختصر سی سرحدی ریاست لاوا نامی سے ٹونک والوں کی کشمکش برسوں سے جاری تھی، لیکن انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے قلع قمع کرنے کا فیصلہ آسان نہ تھا، محمد علی خاں مرحوم سے یہی غلطی سرزد ہوئی، اپنی فوجی طاقت سے لاوا کی ریاست کو انھوں نے تہ و بالا کر دیا، بہت سے آدمی مارے گئے، انگریزوں کی طرف سے وجہ کچھ ہوئی جس کے منتظر ہی بیٹھے تھے، کہتے ہیں کہ جواب اعلان جنگ کے ساتھ انگریزوں کو بھی نواب بے چارے نے دیا۔ ٹونک کا انگریزی فوج نے محاصرہ کر لیا۔ نواب کے سوا ریاست کے دوسرے ارباب بست وکشاد ناعاقبت اندیشی کے اس فیصلے سے جو نواب صاحب نے اعلان جنگ کی صورت میں کیا تھا، ناراض تھے، نواب نے اپنے فوجی اور سول حکام کو بلا کر مقابلہ کا حکم دیا۔ جواب دیا گیا کہ آپ کی فوج انگریزوں سے لڑنے کو تیار نہیں ہے، ہکا بکا ہو کر رہ گئے، اور انگریزوں کے حوالہ اپنے آپ کو کر دیا۔ انگریزوں نے صرف اتنی سزا پر اکتفا کیا کہ گدی سے ان کو اتار دیا۔ اور کچھ ماہوار ریاست سے جاری کر کے حکم دیا کہ زندگی کے باقی دن بنارس میں گذاریں۔ معزولی کے بعد نواب نے بحالی کی کوششوں میں وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے، لیکن کامیابی نہ ہوئی، ان ہی کوششوں کے سلسلے میں غالباً یہ کوشش بھی تھی جس کی طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیان میں اشارہ کیا ہے، تاہم دینی علوم سے چونکہ نواب صاحب کو مناسبت تھی اس لئے لغت حدیث میں مجمع البحار اور بخاری کی فارسی شرح وغیرہ بھی ان کے مصارف سے اسی زمانہ میں شائع ہوئی، اور بنارس میں اسلامی علوم و فنون کے مخطوطات و مطبوعات کا ایک نادر ذخیرہ فراہم ہوا، جو ان کی وفات کے بعد ٹونک منتقل ہوا، پہلے تو اس کتب خانہ کا نظم ان کے چھوٹے صاحبزادے عبد الرحیم خاں مرحوم کی نگرانی میں بہت اچھا اور معقول تھا اب اس کتب خانہ پر کیا گذری واللہ اعلم [illegible]

اپنی اس آرزو کو نواب صاحب مرحوم نے حضرت حاجی صاحب قبلہ تک پہونچایا، انھوں نے لکھوا دیا کہ اس کا نظم کر دیا جائے گا' اس کے بعد بخاری پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے دوسرے حضرات سے جہاں حضرت حاجی صاحب نے اس وعدہ کی تکمیل کی فرمائش کی، اسی سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ جو اتفاقاً اس زمانہ میں مکہ معظمہ ہی میں تھے، یہ کہا کہ

"میں وعدہ کر چکا ہوں آپ بھی ختم میں شریک ہو جائیں"

حضرت نانوتوی کی جن خصوصیات کا اجمالی تذکرہ کر چکا ہوں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچیے مشتبہ اور ناجائز آمدنی رکھنے والے مسلمانوں کی دل شکنی بھی جو برداشت نہیں کر سکتا تھا، "تتی" کی مصیبت کا خرید لینا اس سے زیادہ آسان جس کے لئے تھا وہی آج کسی معمولی آدمی سے نہیں بلکہ اپنے اسی پیر و مرشد سے جس کے تحریری و تقریری احکام کی تعمیل ہی میں پیر و مرشد ہی کی شہادت کے مطابق ساری زندگی بسر ہوئی تھی' اسی سے یہ عرض کرتا ہے، کہ

"حضرت میں نے بخاری اس لئے نہیں پڑھی تھی" (مشائخ الہادی صفر ۲۵۳ھ)

انکار و عدم تعمیل کی یہ عجیب و غریب شکل جس میں ہزاروں اقرار کی روح پوشیدہ تھی، اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے دنیا کے سب سے بڑے مطاع صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہ مقام حدیبیہ ایک سراپا اطاعت اور مجسم فرماں پذیری کی طرف سے اس وقت پیش ہوئی تھی، جب حکم دیا گیا تھا کہ "رسول اللہ" کا لفظ میرے نام "محمد" کے بعد جو لکھا گیا ہے، اسے مٹا دو، لیکن سب سے بڑے مطاع کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ اس سے بڑا اقرار کرنے والا کوئی نہیں ہے، کچھ اسی سنت کا احیاء و اعادہ ایک امتی مطیع کی طرف سے اپنے مرشد مطاع کے آگے کیا جا رہا تھا' عدم تعمیل کے قالب میں تعمیل حکم کی روح جس دل آویز طریقہ سے اس وقت پیش کی گئی تھی کہ جس کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا گیا تھا' وہی اس کو رے جواب کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ "میں تو دیکھتا رہ گیا" آخر میں حضرت تھانوی سے انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ

"میرے اوپر اس کا بڑا اثر ہوا"

کے بعد آخری ملجا و ماوی تھا، مغل دربار میں منجملہ دوسری چیزوں کے مولویوں کے اس خاص طبقہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، جن کا نام اس عہد میں "معقولی" تھا، گرے پڑے، ٹوٹے پھوٹے ان ہی معقولیوں کے لئے رامپور کے سوا شمالی ہند میں کوئی جائے پناہ نہ تھی، خصوصاً مرحوم نواب کلب علی خاں نے مغل دربار کے لوازم و آثار کی حفاظت میں اپنے بس سے زیادہ ولولہ کا اظہار چونکہ کیا تھا، اس لئے ان کے دور میں معقولی علماء کے امام الائمہ مولٰنا عبدالحق خیرآبادی تک رامپور ہی پہنچ گئے، کہتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے استاذ مولانا مملوک العلی صاحب نے اقلیدس کا جو ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا، اس پر

"مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی نے رکیک الفاظ میں اعتراض کئے تھے" ۱۹۹

اس اعتراض کی خبریں سیدنا الامام الکبیر تک بھی پہونچتی رہتی تھیں، نیز اسی زمانہ میں "تحذیرالناس" نامی رسالہ کے بعض دعاوی کی وجہ سے بعض مولویوں کی طرف سے خود سیدنا الامام الکبیر پر طعن و تشنیع کا سلسلہ جاری تھا، الغرض کچھ تو ان واقعات کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ "معقولیت" کا مطلب ہی اس زمانہ میں یہ تھا کہ آدمی بجائے آدمی کے مُرغ بلند بانگ بن جائے، اور اپنی بانگ کے مقابلہ میں کسی دوسرے مرغ کی بانگ اس کے لئے ناقابل برداشت بن جائے، رامپور اس قسم کے بانگ دینے والے مرغوں سے اس زمانہ میں بھرا ہوا تھا، سیدنا الامام الکبیر نے حالانکہ ان ہی وجوہ سے چاہا کہ آپ کی تشریف آوری کی خبر مشہور نہ ہو لیکن مشک کی خوشبو کو عطار بھی تو چھپانے کے باوجود چھپا نہیں سکتا، خبر پھیل ہی کر رہی، مولویوں اور ان کے عقیدت مند تلامذہ میں ہلچل مچ گئی، خود حضرت والا سے کچھ کہنے سننے کی جرأت تو کوئی نہ کرسکا، البتہ آپ کے ساتھ بعض طلبہ بھی تھے، ان کے ساتھ چھیڑ خانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ارواح ثلاثہ میں ہے کہ ایک دفعہ جب آپ کے طالب العلم (مولٰنا احمد حسن امروہی) کو کسی نے چھیڑا، تو حضرت والا نے جھنجھلا کر اس طالب العلم سے کہا کہ

"اگر یہ (احمد حسن) عاجز ہوئے تو میں ان کی مدد کروں گا، اور اگر تم عاجز ہوئے تو تمہارے استاد تمہاری مدد کریں گے، پھر یہ کیوں نہ ہو کہ تم اپنے استاد کو لے آؤ، اور میری

ان سے گفتگو ہو جائے" (ص۱۹۱ ارواح)

بات مناظرہ اور مباحثہ والی تو اسی پر ختم ہو گئی، لیکن اسی کے بعد لوگوں نے وعظ گوئی پر حضرت والا سے اصرار کیا راضی ہو گئے، واللہ اعلم بالصواب مولوی حمید الدین سنبھلیؒ جیسے ثقہ راوی کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ

"شب کو مجلس وعظ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی شہر کے امراء و رؤسا، علماء عمائد شہر طلبہ غرض کہ ہر طبقہ کے لوگ بھر گئے تھے، اور لوگوں کا ایک میلہ سا لگ گیا تھا"

آخر وہی کہتے تھے کہ

"بس اس دن شاید بچے اور عورتیں گھروں میں رہ گئی ہوں گی، ورنہ کُل شہر مجلس وعظ میں آ گیا تھا"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"شہر کے تمام مشاہیر علماء سوائے مولوی عبد الحق خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے" ص۱۹۱

گویا یوں سمجھئے کہ سارا شہر ہی امنڈ آیا تھا، اس دن کی تقریر کے متعلق منشی حمید الدین یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

"ایک غیر معمولی جلال اور جوش کی شان سے (وعظ) بیان فرمایا"

اس غیر معمولی جلال اور جوش کی شان کے واقعی اسباب کیا تھے صحیح علم تو اس کا علام الغیوب ہی کو ہے، لیکن منشی حمید الدین کا تاثر جیسا کہ وہی کہتے تھے یہ تھا کہ رامپور

"کے طلبہ نے مولوی احمد حسن (امروہی) سے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی"

؎ مخدوم و محترم مفتی عبد اللطیف صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ و مسلم یونیورسٹی جنھوں نے مولوی حمید الدین مرحوم کو دیکھا تھا، اور ان کی صحبتوں میں کافی وقت مفتی صاحب کا گذرا ہے، وہی مولوی حمید الدین کا ذکر غیر معمولی الفاظ میں کیا کرتے تھے، ان کی عقل کی ذہن کی فہم و فراست، سیرت و کردار کی تعریف بھی کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں ۱۲

"یہ جوش کی شان اسی وقت سے پیدا ہوئی تھی" ص ۱۹۹

بہر حال اسباب و مؤثرات کچھ بھی ہوں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گو حسب دستور آغاز تقریر کا تو قرآن ہی کی ایک آیت سے فرمایا گیا، لیکن قرآنی الفاظ ہی سے "معقولات" کہیے، یا "فلسفہ مغلیہ" کے سارے سرمایہ ناز مسائل[1] کے متعلق صحیح صحیح نتائج نکال نکال کر دکھایا اور سنایا جا رہا تھا کہ قرآن میں یہ باتیں مل سکتی ہیں، بے چارے معقولی مولویوں کو تو اس کا سان و گمان بھی نہ تھا، سننے والے بہوت و حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا سنایا جا رہا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس وقت جلال اور جوش کا ایک رنگ تھا، سب کچھ سنانے کے بعد منشی حمید الدین کا بیان تو یہ ہے کہ آخر میں سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ

"لوگ گھر میں بیٹھ کر اعتراض کرتے ہیں، اگر کچھ حوصلہ ہے، تو میدان میں آ جائیں"

وہی یہ بھی کہتے ہیں کہ خاتمہ اس علمی تحدی یا چیلنج کا ان الفاظ پر ہوا تھا کہ

"مگر ہرگز اس کی توقع نہ کریں، کہ وہ قاسم سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔"

فقرہ تو فقرہ، جہاں تک میرا خیال ہے اس نوعیت کا خطرہ بھی، حضرت والا کے دل و دماغ میں کبھی نہ گذرا ہو گا، مگر آج یہی کہا گیا، یا کہلوایا گیا تھا، دوسری شق ہی میرے نزدیک اس لئے قابل ترجیح ہے کہ معاً اسی کے بعد منشی حمید الدین نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے بھی سنا، یعنی جن لوگوں کو چیلنج دیا گیا تھا، ان ہی کو سنا کر فرما رہے تھے کہ

"میں کچھ نہیں ہوں، مگر جن کی جوتیاں میں نے سیدھی کی ہیں، وہ سب کچھ تھے"

ظاہر ہے کہ علماء و فضلاء، معقولات کے جبابرہ اصحاب جدل و مکابرہ سے بھری ہوئی رامپور کی

---

[1] تقریر کے عنوان کے لئے جس آیت کا انتخاب فرمایا گیا تھا وہ سورۂ واقعہ کی ابتدائی آیتیں تھیں، منشی حمید الدین کا بیان ہے کہ اجزاء لا یتجزیٰ، قیام قیامت بحدوث عالم وغیرہ جیسے معقولات کے اہم مسائل پر اسی آیت کے الفاظ کی روشنی میں بحث فرماتے جاتے تھے، حضرت تھانوی نے دوسروں کی منکر عربی زبان میں ان خیالات کو قلم بند فرما دیا تھا صدرا مطبوعہ مطبع مجتبائی کے حاشیہ پر آپ کی قلم بند کی ہوئی تقریر چھاپ بھی دی گئی ہے، حصہ دوم میں سیدنا الامام الکبیر کے علمی نظریات و افکار پر بحث کرنے کا موقعہ اگر میسر آیا، تو انشاء اللہ اسی میں اس تقریر کا خلاصہ بھی درج کر دیا جائے گا۔

اس مجلس میں "میں کچھ نہیں ہوں" کے اعتراف و اقرار میں جس نے اپنی اہانت نہیں محسوس کی یقیناً عوام و خواص کے اس بھرے میلے میں جو یہ کہہ سکتا تھا' سابق الذکر فقرے کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے خود نہیں کہا تھا بلکہ کہلانے والے نے کہلوا دیا تھا' تو آخر خود سوچئے کہ دونوں قولوں میں تطبیق کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے، خصوصاً کسرِ نفسی کی بنیاد پر غلط بیانی سے کام لینے کی عام عادت کا جس کے متعلق کبھی تجربہ نہ ہوا ہو' اور یہ روایت تو منشی حمید الدین سنبھلی مرحوم کی ہے' لیکن اسی قصے کے بعض اجزاء حضرت تھانوی کے ملفوظات طیبہ میں جو پائے جاتے ہیں' جن میں ایک جزء یہ بھی ہے' کہ سیدنا الامام الکبیر نے اسی موقعہ پر اس کا اعلان بھی فرمایا تھا کہ

"معقول کے تمام مسائل کو نفیاً یا اثباتاً قرآن شریف سے نکال سکتا ہوں"[1] قصص ص ۲۵

الہادی ماہ جمادی الثانی ۵۰ھ

افسوس ہے کہ منشی حمید الدین کے بیان میں یہ جزء نہیں پایا جاتا' لیکن ظاہر ہے کہ عدم ذکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی تقریر میں یہ جزء شریک نہ تھا' کچھ بھی ہو' حضرت تھانوی کی روایت کے ان الفاظ کے بعد میرا احساس تو یہ ہے کہ تحدی اور چیلنج کے رنگ میں پیش کرنے والوں نے رامپور والی تقریر کے خاتمہ کو جو پیش کیا ہے، شاید اس رنگ میں خود بیان کرنے والوں کی ذاتی خواہشیں بھی شریک ہو گئی ہیں' ورنہ ان الفاظ کی روشنی میں تحدی سے زیادہ مجھے تو مشورے کا رنگ غالب نظر آتا ہے' مطلب یہ ہے کہ "معقولات" کے نام سے جن علوم کی تعلیم ہمارے قدیم عربی مدارس میں ہوتی تھی' بظاہر تو یہی کہا جاتا تھا کہ منطق اور منطق کے بعد اور منطق کے ساتھ فلسفہ کی کتابیں معقولات کے نام سے

---

[1] میں نے اس واقعہ کے سلسلہ میں حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے یہ جزء بھی سنا ہے کہ اس وعظ میں حضرت نے خطبۂ ماثورہ کے بعد آیت کریمہ اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتہا کاذبۃ الی قولہ فکانت ھباءً منبثا تک تلاوت فرمائی۔ اور فلسفہ کے تمام معرکۃ الآراء اور مایۂ ناز مسائل کا رد و قدح اسی آیت کے الفاظ سے فرمایا۔ جزء لایتجزیٰ کا ابطال اذا رجت الارض رجاً و بست الجبال بساً سے فرما کر قیامت کا اثبات فرمایا۔ گویا اس چیلنج میں صرف اسی کی تحدی نہ تھی کہ میں معقول کے تمام مسائل کو نفیاً یا اثباتاً قرآن سے نکال سکتا ہوں بلکہ بہت سے مشہور اہم اور معرکۃ الآراء مسائل کو نکال کر دکھلا بھی دیا جس سے سامعین ورطۂ حیرت میں غرق تھے۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ لوگوں کا عالم کانَّ علیٰ رؤسہم الطیر کا تھا۔ (محمد طیب غفرلہ)

کو تصدیق کرنی پڑے گی، اور علم کا نیا باب ان پر کھل جائے گا" اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ مولٰنا محمد یعقوب یعنی ہمارے مصنف امام کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

"ہر وقت کتابیں دیکھا کرتے تھے"۔

اسی کے ساتھ یہ بھی جو فرمایا کرتے تھے کہ

"مولٰنا محمد قاسم صاحب تو کتاب سے کچھ کہتے ہی نہ تھے اس فہم خداداد سے کہتے تھے" ص۲۶۰

جس کی نسبت وارد ہے کہ من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین[1] ص۲۹ الہادی

ظاہر ہے کہ "کتاب سے کچھ کہتے ہی نہ تھے" اس میں کتاب کے لفظ سے یقیناً وہی کتابیں مراد ہیں جو آدمیوں کی بنائی ہوئی ہیں، ورنہ "الدین" کی فقہ اور سمجھ کی بنیاد جس "الکتاب" پر قائم ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر جو کچھ بھی کہتے تھے، اسی "الکتاب" ہی سے اخذ واستنباط کرکے کہتے تھے، ان کی تحریری یادگاریں موجود ہیں، شہادت کے لئے وہی کافی ہیں، ہاں یہ سچ ہے کہ خالق کی اس "الکتاب" کو پکڑ لینے کے بعد مخلوق (انسانوں) کی بنائی ہوئی کتابوں سے حاصل کرکے کچھ کہنے کی ضرورت ان کو باقی نہیں رہی تھی، اور رامپور کی اس مجلس میں آپ کا مذکورہ بالا دعویٰ بھی اسی خداداد نعمت ہی پر مبنی تھا جو "اشتغال بالقرآن" کے صلہ میں آپ کو عطا ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی اپنی اس طوالت سے مقصود تھا، مقصد ہے یہ کہ معقول کے تمام مسائل کو قرآن شریف سے نکالنے کا یہ مطلب لینا کہ معقول سے حضرت والا کی مراد وہ علوم ہیں، جو "فلسفہ" کے عام عنوان کے نیچے درج سمجھے جاتے ہیں جن میں طبیعیات و ریاضیات و ما بعد الطبیعیات اور ان میں ہر ایک کی فنی شاخوں میں جن چیزوں سے بحث کی جاتی ہے، اور ان کے متعلق مسائل و نظریات ان میں پائے جاتے ہیں، ان سب کے متعلق آپ دعویٰ پیش کر رہے تھے کہ قرآن سے نکال کر دکھا سکتا ہوں،

[1] بھلائی کا ارادہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے متعلق فرماتے ہیں تو اس کو دین سمجھا دیتے ہیں ۱۲

اس فائدے کو بھی قرآنی آیتوں میں غور و فکر کرنے سے چاہا جائے تو حاصل کیا جا سکتا ہے، اب جو کچھ بھی خیال کیا جائے، اپنے ان ہی احساسات کہیے، یا وسوسوں کے زیر اثر اس طول بیانی کی مجھے ضرورت محسوس ہوئی، ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ "دھبہ" کے نام سے جس اثر کو علم کے تعلق کی بنیاد پر اپنی طرف سیدنا الامام الکبیر منسوب کرتے تھے اس "دھبے" یا "داغ" کی اضطراری نمائش اور غیر اختیاری ظہور ساری زندگی میں کبھی اگر ہوا ہی ہے تو وہ بھی چند گنے چنے مواقع ہیں، محرک بھی اس کی عموماً وہی دینی و علمی غیرت بن جاتی تھی، جسے آپ شاید دبا نہیں سکتے تھے۔ رامپور کی اس تاریخی مجلس میں بھی زبان مبارک پر کچھ الفاظ اگر جاری ہوئے تو آپ دیکھ چکے ہیں، کہ نکلنے کی حد تک تو وہ فقرے بہرحال نکل ہی پڑے، لیکن معاً اسی کے ساتھ "میں کچھ نہیں ہوں سو اس بار کو جو ان الفاظ سے قدرۃً آپ کے قلب نازک پر پڑ گیا تھا، ہلکا کرنا چاہتے تھے، اور اختیار کا دامن جس جذبہ کی بدولت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اسی کی طرف ان الفاظ میں چاہے توجیہ کہیے یا معذرت پیش فرما رہے تھے کہ "مگر میں نے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں وہ سب کچھ تھے"

مراد آپ کی خانوادہ ولی اللہی کے علماء سے تھی جن سے آپ نے تعلیم پائی تھی، (اور احقر کے علم کے مطابق جو بزرگوں سے سنا ہے اشارہ اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی طرف تھا، جن کی تربیت کی بدولت علم لدنی کا یہ ذخیرہ انھیں ملا تھا اور اسی بنا پر حضرت حاجی صاحب انھیں اپنی لسان سے تعبیر فرماتے تھے اور تشبیہ دیا کرتے تھے کہ جیسے شمس تبریز کو عارف رومی زبان بنا کر دیئے گئے تھے ایسے ہی مجھے مولانا محمد قاسم زبان بنا کر دیئے گئے ہیں) (محمد طیب غفرلہٗ)

عرض کر چکا ہوں کہ آپ کے استاذ مولانا مملوک العلی صاحب نے اقلیدس کا ترجمہ اردو میں جو کیا تھا اس ترجمہ پر مولانا عبد الحق صاحب کی طرف سے مشہور کیا گیا تھا کہ رکیک الفاظ میں تنقید کی گئی ہے، اگر یہ واقعہ ہوا بھی تھا، تو اس کی حیثیت سمجھنا چاہیے کہ قریبی محرک کی تھی، ورنہ مولانا اسماعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی (جو مولانا عبد الحق خیر آبادی کے والد ماجد تھے) ان

دونوں بزرگوں میں باوجود ہمدرس ہونے کے مسئلہ امتناع نظیر پر علمی زور آزمائیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور آخر میں بات بہت دور تک پہنچ گئی، اسی کے بعد ولی اللہی خاندان کے دینی علماء اور خیرآباد کے معقولاتی مولویوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بہت زیادہ وسیع ہو گئی، تقریر و تحریر میں علمی حدود سے تجاوز کر کے سب و شتم پر لوگ اتر آئے۔

مسلمانوں کا قومی مزاج نقطۂ اعتدال سے منحرف ہوتے ہوئے بدترین اخلاقی زبوں حالیوں کا شکار تھا، معمولی پھنسی بھی سرطان و خنازیر کی شکل اختیار کر لیتی تھی، ناگفتہ بہ قصے پیش آئے، خدا کا شکر ہے کہ اب ان کے آثار تقریباً مٹ چکے ہیں، اس خوابیدہ فتنہ کا جگانا میرے خیال میں خود ایک فتنہ ہوگا، اسی لئے خاکسار نے شاید مقدمہ میں بھی ان قصوں کو جگہ نہیں دی ہے، اور یہاں بھی ان اجمالی اشاروں کے سوا تفصیل میں فائدے سے زیادہ مضرت ہی کا احتمال ہے، حالانکہ رامپور میں اپنی افتاد طبع کے برخلاف جس غیر معمولی برہمی، جلال و جوش کا ظہور سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ہوا صحیح طور پر اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو ولی اللہی اور خیرآبادی ہندوستان کے ان دونوں تعلیمی و درسی خانوادے کے حریفانہ تعلقات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں[1]۔

[1] جیسا کہ میں نے عرض کیا قصہ کی ابتدا مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق خیرآبادی کی نوک جھونک سے ہوئی، مولانا فضل حق کا دعویٰ تھا کہ رسول اللہ کو پیدا کرنے کے بعد اب رسول اللہ کی نظیر یعنی جن صفات سے آپ موصوف تھے، ان ہی صفات رکھنے والی دوسری ہستی کو خدا پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، اس کی قدرت ہی سے یہ بات خارج ہو گئی ہے، مولانا شہید فرماتے تھے کہ رسول اللہ جیسی ہستی یہ تو صحیح ہے نہ پہلے پیدا ہوئی اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہوگی، لیکن آپ کی نظیر یعنی آپ کی جیسی ہستی کے پیدا کرنے پر خدا (العیاذ باللہ) قادر بھی نہ رہا یہ خدا کی ذات کے ساتھ بڑی جرأت ہے، منطقی موشگافیوں کے زور سے چونکہ سب کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے، مولانا شہید کی اس سیدھی سادی بات کو مولانا فضل حق صاحب نے اپنی منطقی زور آزمائیوں کی جولانگاہ بنا لیا۔ دونوں طرف سے موٹی موٹی کتابیں شائع ہوئیں، لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں جب دلّی مولویانہ پینتروں کی دنگل بنی ہوئی تھی، یہ بھی دیکھا گیا کہ مولانا اسمٰعیل دلّی سے نکلے اور پنجاب کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کے پنجوں سے نکالنے کی کوششوں میں شہید ہونے کا ایمانی مقام بالاکوٹ کے پہاڑ کے نیچے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور اسی کے بعد جب غدر کے نام سے ہندوستان میں ہنگامہ برپا ہوا تو دیکھا گیا کہ قلم کو توڑ کر کاغذ پھاڑ کر، مولانا فضل حق فوجی کمان ہندوستان کے ان باشندوں کی اپنے

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

خلاصہ یہ ہے کہ محرکات خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن ایک تو وہی رامپور والی مجلس کے قصے میں، اور دو ایک جگہ خانگی مجلسوں میں جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے، علم کے اس غریب "دھبے" کو بھی نمایاں ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا، اور ساری عمر جس جد و جہد، کد و کاوش میں گذری، اس کا اندازہ آپ کو ان بکھرے ہوئے واقعات و سوانح سے ہو سکتا ہے، جو ادہر اُدہر مختلف بیانوں کے ذیل میں بحمد اللہ محفوظ رہ گئے ہیں، سب کا استیعاب تو مشکل ہے لیکن نیچے تک پہونچنے کے لئے شاید اتنی چیزیں بھی کافی ہو سکتی ہیں جو اب آپ کے سامنے رکھی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں پہلی بات تو وہی ہے جس کا عموماً لوگوں نے تذکرہ کیا ہے، میں اپنے مصنف امام کی کتاب سے اسے نقل کرتا ہوں، انھوں نے سیدنا الامام الکبیر کی خصوصی عادات، والتزامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مسئلہ کبھی نہ بتلاتے، حوالہ کسی پر فرماتے" ص ۳۱

"کبھی" کے لفظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی یہ دوامی عادت تھی، حضرت حکیم الامت کے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۴) ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں جو باہر سے آئے ہوئے انگریزوں کی حکومت کا جوا اپنی گردن سے اتارنے پر تل گئے تھے، اس مہم کی ناکامی کے بعد دوسروں کے ساتھ مولٰنا فضل حق بھی گرفتار ہوئے مقدمہ چلا، تواتر کیساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ بغاوت کا جو جرم ان پر عائد کیا گیا تھا، اگر اس جرم کا انکار کر دیتے، تو رہائی مل جاتی، لیکن جو واقعہ تھا، اسی کو بیان کرتے رہے، عبور دریائے شور کی سزا ہوئی، انڈمان جلا وطن کر دیئے گئے، وہیں وفات بھی ہوئی کہتے ہیں کہ قرآن مجید بھی انڈمان ہی میں زبانی یاد کیا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے میں نے اجمالاً اشارہ بھی کیا ہے کہ حدیث کی تعلیم مولانا فضل حق نے مولانا اسمٰعیل کے ساتھ ایک ہی حلقہ میں شاہ ولی اللہ کے منجھلے صاحبزادے مترجم قرآن مولانا شاہ عبد القادر صاحب سے پائی تھی جو مولانا اسمٰعیل کے حقیقی چچا تھے، خیر آباد کے تدریسی سلسلے سے تعلق رکھنے والوں سے تو نہیں لیکن دیو بندی حلقہ کے علماء میں ہم تم کے متعدد قصے منقول ہیں کہ جب مولانا فضل حق کو خبر ملی کہ مولانا اسمٰعیل شہید ہو گئے تو جواب میں ان کے جو کتاب لکھ رہے تھے اسی وقت اس کا لکھنا بند کر دیا۔ حکیم الامت تھانوی بھی اس کے راویوں میں ہیں، اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک شخص مولٰنا فضل حق کے پاس اس نیت سے پہنچا کر چھیڑ کر مولانا شہید کو کچھ برا بھلا ان سے کہلواؤں مولانا فضل حق کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا سخت غضب ناک ہوئے اور اسی وقت گھر سے نکلوا دیا۔ بہرحال ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقابلین کی آیت کے صادق ہونے کی صورت ہوئی، کچھ ایسے موقعے بھائیوں میں بھی پیش آجاتے ہیں۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم ۱۲

ملفوظات میں بھی ہے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب فتوٰی نہیں دیتے تھے" (الہادی ربیع الثانی ۵۳ھ)

لیکن مطلب اس کا بظاہر یہی ہے کہ عام عادت حضرت والا کی یہی تھی، اور زیادہ تر تعلق اس کا ان سوالات سے معلوم ہوتا ہے جو زبانی لوگ حوادث یومیہ کے متعلق پوچھا کرتے ہیں، ورنہ تحریراً اگرچہ وہ بھی بطور ندرت زیادہ تر کسی اہم اصولی سوال، یا جس میں اندیشہ ہوتا کہ مسلمانوں کو لوگ فتنہ میں مبتلا کردیں گے اور آپ کی تحریر اس فتنہ کے دبانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی، اس قسم کے سوالوں کے متعلق آپ کی تحریریں موجود ہیں، اگرچہ ان تحریروں میں بھی جواب کے ساتھ ساتھ اس قسم کے فقرے بھی قلم مبارک سے نکلتے جاتے تھے مثلاً ایک مکتوب گرامی جس میں بعض اہم سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، آخر میں بے ساختہ "مگر" کے ساتھ

"نہ قاضیم، نہ فقیہم، نہ مفتیم، نہ امام" (فیوض قاسمیہ)

کا مصرعہ بھی اسی کے ساتھ قلم پر آگیا ہے۔ اور اسی کے بعد یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

"اگر دیگراں ہم صفیر شوند فبہا، ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند، ایں دفتر بے معنی را بر سر من زنند و ہرچہ مناسب وقت دانند و موافق اشارات علماء ربانی کہ از اتباع قرآن و حدیث دور نیفگند اختیار فرمایند"

اور اس عادت کے خلاف بطور "ندرت" سوال کے جواب دینے کے بعد جو صورت حال پیش آتی ہے وہ اس مقصد کے لئے جس کے پیش نظر ان چیزوں کا میں تذکرہ کروں گا، بڑا اثر انگیز، اور عبرت خیز ہے اس قصے کے راوی حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ ہیں، فرماتے تھے کہ

مولانا محمد قاسم صاحب میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشاء کے وقت ایک مسئلہ پوچھا"

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی ایسے مولوی صاحب جو سوال کا جواب دے سکتے ہوں، وہاں موجود نہ ہوں گے اور سوال میں ٹالنے کی گنجائش نہ تھی، مجبوراً جیسا کہ حکیم الامت فرماتے ہیں،

"آپ نے (مولانا نانوتوی نے) اس کا (اس سوال کا) جواب دیا"

اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہی سننے کے قابل ہے، سوالوں کے جواب اور فتویٰ نہ دینے کی عادت سے وہ نتیجہ کہیں زیادہ قیمتی ہے، جو قدرت کی طرف سے اس واقعہ کے اتفاقاً پیش آجانے کی وجہ سے پیدا ہوا، حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ جواب تو آپ نے دیدیا۔ لیکن سائل جب چلا گیا، تو سیدنا الامام الکبیر کے

ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے یہ مسئلہ یوں یاد ہے ......"

شاگرد نے استاذ کے سامنے اپنے علم کا اظہار کیا، استاذی اور شاگردی کے تعلقات کے نفسیات کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہی اندازہ کر سکتے ہیں، کہ شاگرد کی اس قسم کی جرات استاذ میں کس کیفیت کو پیدا کرتی ہے، لیکن سنئے یہاں کیا اثر ہوا، حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ

"آپ نے (مولانا نانوتوی نے) فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو"

اور کیا بات صرف اسی پر ختم ہوگئی، یا اس کے بعد صرف یہ ارادہ کر لیا گیا کہ پوچھنے والے تک کسی طرح مسئلہ کی صحیح صورت پہنچا دی جائے گی، حضرت تھانوی ہی راوی ہیں، شاگرد کے بیان کی توثیق کرنے کے بعد وہی کہتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

"مستفتی (فتویٰ پوچھنے والے) کو تلاش کرنا شروع کیا"

عشاء کے وقت سوال پوچھا گیا تھا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد شاگرد نے اپنے علم کو گوش گذار کیا تھا، پوچھنے والے صاحب مسجد سے جا چکے تھے، رات کافی گذر چکی تھی، تلاش پر اصرار جب زیادہ بڑھا تو

"لوگوں نے عرض کیا کہ رات زیادہ ہوگئی ہے، اب آرام فرمایئے ہم صبح ہونے پر اس کو بتا دیں گے"

لیکن فہمائش عرض و معروض اس سلسلے میں جو کچھ کئے گئے سب بیکار ثابت ہوئے، اور بقول حضرت تھانوی

"آپ نے قبول نہ فرمایا"

پھر کیا ہوا؟ کیا اسی شاگرد یا کسی اور کو پوچھنے والے کے گھر بھیجا گیا، سنئے مولانا تھانوی خبر دیتے ہیں کہ بنفس نفیس خود سیدنا الامام الکبیر اٹھے، اور رات کی اسی تاریکی میں۔

"اس کے (پوچھنے والے کے) مکان پر تشریف لے گئے، گھر میں سے اس کو بلایا"

غریب پریشان ہو کر باہر نکل آیا کہ آخر کیا افتاد پیش آئی کہ اس کی بھیگی، سونی رات میں حضرت والا نے اس کے گھر تک قدم رنجہ فرمانے کی زحمت برداشت کی، مگر وہ بھی سن رہا تھا، آسمان سن رہا تھا زمین سن رہی تھی، کہ ہندوستان جس کے علم و فضل تقویٰ و طہارت، ذہن و ذکاوت کے چرچوں سے گونج رہا تھا، وہی اس غریب عامی مسلمان کے سامنے کھڑا ہو کر یہ کہہ رہا تھا کہ

"ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلا دیا تھا، تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے صحیح مسئلہ ہم کو بتلایا، اور وہ اس طرح ہے"

حقیقت تو یہ ہے، کہ باہر کی اس غلطی سے جو قدرت ہی کی طرف سے صادر کرائی گئی تھی، اندر کی صحت کے متعلق جتنی صحیح اور سچی روشنی میسر آرہی ہے، شاید یہ بات صحیح مسئلہ بتانے کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی،

بہر حال عام عادت والتزام پر اس قسم کے نادر استثنائی واقعہ کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور واقعہ وہی ہے، جو مصنف امام نے فرمایا ہے، کہ آپ فتویٰ نہیں دیتے تھے حضرت تھانوی اور ان کے سوا بھی دوسرے بزرگوں کی شہادتوں کے سوا ایک خط ہے جو "فیوض قاسمیہ" کے مجموعہ میں شریک ہے۔ خورجہ کے مشہور عالم و مصنف وطبیب مولانا نصر اللہ خاں مرحوم کے نام یہ خط ہے کہ انھوں نے یزید کے کفر و ایمان کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کی رائے دریافت کی تھی، اسی کے جوابی مکتوب میں یہ فرماتے ہوئے کہ

"میں حیران ہوں، نہ میں ایسا عالم، نہ ایسا محقق، مجھکو آپ نے کیوں اس کام کے لئے تجویز کیا"!

آگے اپنے متعلق خود ہی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"مجھکو تو کبھی فتوٰی لکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا"

یہی نہیں کہ خود فتوٰی دینے سے پرہیز ہی فرماتے تھے، بلکہ مصنف امام کے ان الفاظ سے یعنی

"فتوٰی پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار" ۳۱

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے دیئے ہوئے فتووں پر تصدیقی دستخط اور مہر ثبت کرنا' علماء کا جو عام دستور اور طریقہ ہے اس سے بھی احتراز فرماتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتوے وافتاء سے پرہیز وگریز کی عادت حضرت والا کی عام مسلمانوں میں مشہور بھی تھی' اپنے ایک مکتوب میں خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"از فتوٰی و استفتاء احتراز من مشہور ست" (فیوض قاسمیہ ص۲۹)

اسی موقعہ پر جہاں اس شہرت کا ذکر آپ نے فرمایا' کبھی کبھی بعض اصولی یا فروعی مسائل کے متعلق آپنے پوچھنے والوں کو جواب جو دے دیا ہے' اس کی وجہ بھی ان الفاظ میں ظاہر کردی گئی ہے کہ

"من بغرض دعا' ایں کار کردہ ام"

اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ان ہی خطوط میں اپنے نیازمندوں کو بے جھجھک اس قسم کی باتوں کے لکھنے کا جو عموماً عادی ہو' مثلاً بھوپال جو اس زمانہ میں ہندوستان کے مولویوں کی چند خاص امیدگاہوں میں ایک بڑی اہم امیدگاہ تھی' اسی ریاست کے وزیر اعظم مولوی جمال الدین مرحوم کے پوتے جن کا نام مولوی ابوالقاسم تھا' ان ہی کے ایک علمی سوال کا جواب دیتے ہوئے پہلے تو کتابوں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

"آں مخدوم را خود معلوم ست ہیچو سپاہی کہ آلۂ ضرب بدست ندارد، و عالمے کہ کتابے در بغلش نبود، بکارے نیاید!"

آگے ارقام فرماتے ہیں کہ

"خصوصاً کسے کہ از علم ہم جز نام بدست نیاوردہ"

اور اس میں تو غنیمت ہے کہ نام ہی کی حد تک سہی، لیکن علم کی طرف انتساب کو قبول تو فرمایا گیا ہے، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ آج تقریباً ایک صدی سے ہندوستان میں علم دین کا چرچا جس کے دم قدم سے قائم ہے، وہی اپنے ایک عقیدت مند کو انتہائی بے تکلفی کے ساتھ سادہ الفاظ میں اطلاع دیتا ہے اپنے قلم سے تحریر کرتا ہے، یہ خط اردو میں ہے اسی میں فرماتے ہیں

آپ جانتے ہیں کہ میں خود ذی علم نہیں ہوں" (فیوض قاسمیہ ص ۶)

ان ہی خطوط میں ایک خط میر محمد صادق مرحوم کے نام فارسی زبان میں ہے اس میں میر صاحب کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

" میدانی وہمہ می دانند نہ سفینہ بہ گنجینہ آوردہ ام و نہ مکتوبات سفینہ را در سینہ سپردہ" ص ۲۴

اسی طرح اپنے ایک معاصر عالم یعنی وہی خورجہ والے مشہور عالم وطبیب مولنا نصر اللہ خاں کے نام جو مکتوب اردو زبان میں لکھا گیا ہے، اس میں بھی یہی اطلاع دی جاتی ہے کہ

" نہ میرے پاس اس کام (فتوی نویسی) کا سامان، نہ کتابیں، نہ متقدمین و متاخرین کی بیاضیں" (فیوض ص ۳۱)

اس قسم کے اعترافات کا ایک ذخیرہ آپ کے مرقومات و مکتوبات میں پایا جاتا ہے۔ اندازہ کرنے کے لئے یہ مثالیں کافی ہیں، ایک طرف ان نمونوں کو رکھئے، اور ان کے مقابلہ میں سوچئے کہ خود تو اعتراف کی جرات کون کر سکتا ہے، میں نے تو دیکھا ہے کہ دوسرے بھی کسی کے متعلق اگر اس کا محسوس ہوا کہ مولوی صاحب کے علم کی وقعت اس کے دل میں نہیں ہے تو اس غریب کے مردود و مطعون ہونے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے، خود بھی علم کے غرور میں بھرے ہوئے ہیں اور چاہتے بھی ہیں کہ انکے غرور یا فریب کا دوسرا بھی شکار رہے، جو ہتھکنڈے اس سلسلہ میں استعمال کرنے والے استعمال کرتے ہیں، بہ نسبت دوسروں کے خود استعمال کرنے والوں ہی کو اس کا زیادہ علم ہو سکتا ہے، زبردستی دوسروں پر اپنے علم و فضل کا سکہ قائم کرنے کے لئے کرنے والے جو کچھ کرتے رہے ہیں، یا آج بھی کرتے ہیں، ان کے لئے یہ کتنے عبرت آموز اسباق ہیں، جو سیدنا الامام الکبیر اسی علمی گروہ کی عبرت پذیری کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں، سننے میں آیا ہے اور

مولویت کے لوازم و آثار میں ایک وعظ گوئی کا پیشہ بھی ہے، جیسے افتاء و امامت کی توقع علم ہی کے علماء سے لوگ کرتے ہیں، یا خود علماء ہی ان امور کا حقدار اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، یہی حال وعظ وتلقین تذکیر و خطابت کا بھی ہے، اس میں شک نہیں کہ بہ نسبت افتاء اور امامت کے آخر زندگی میں تقریر و بیان سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کی ایک خصوصیت بن گئی تھی، صوبجات متحدہ خصوصاً جو آبادیاں اس صوبہ کی روھیلکھنڈ میں مشہور و معروف ہیں، شاید ہی کوئی شہر بلکہ ممتاز قصبہ ایسا ہوگا جس کے باشندوں کو حضرت والا کی تقریر کے سننے کا موقعہ نہ ملا ہو خصوصاً سہارنپور، میرٹھ، دیوبند، خورجہ، رامپور، شاہجہانپور، رڑکی وغیرہ میں سننے والوں کو خطابت و بیان کے جس ملکہ فائقہ کے مسلسل تجربات ہوئے ان ہی کی بنیاد پر ارباب علم و بصیرت میں مشہور ہو گیا تھا کہ

"مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح القدس کی تقریر ہو رہی ہے"[له]

لیکن خطابت و تقریر کے اس میدان میں خود اترے تھے، یا اتارنے والوں نے اصرار کر کے مسلمانوں کو حضرت والا کے بیانی کمالات سے مستفید ہونے کا موقع عطا کیا تھا؟ سب سے پہلی شہادت تو اس سلسلہ میں خود مصنف امام کی ہے کہ

(ص ۳۹۵ کا باقی حاشیہ ملاحظہ فرمایئے) میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ میں امامت کے لائق نہیں ہوں، لوگوں نے کہا کیسے کیا پتہ تھا کہ تو قرآن بھی سیدھا پڑھنا نہیں جانتا۔ حضرت نے اس پر یہ فرمایا کہ مولویوں سے یہ سنا ہے کہ نماز تو اس طرح بھی ہو جاتی ہے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس پر لوگوں نے تند لہجوں میں کہا کہ چوری اور سرزوری، ایک تو نماز الٹی پڑھا دی اور اوپر سے مولویوں کو بدنام بھی کرتے ہو، یہاں یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ حضرت کو ڈھونڈتی ہوئی ایک جماعت ادھر آنکلی اور دیکھا کہ حضرت جاہلوں میں گھرے ہوئے ہیں، تب انھوں نے لوگوں کو بتلایا کہ تم کس کے ساتھ یہ معاملہ کر رہے ہو، یہ تو مولانا محمد قاسم صاحب ہیں اس پر لوگ نادم ہوئے اور عجز و نیاز سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ بہر حال دونوں واقعات سے کیسی کیسی مجبور ہو کر امامت کرنا ثابت ہوتا ہے۔

"محمد طیب"

متعلقہ صفحہ ہذا له یہ فقرہ اپنے عم محترم حضرت الاستاذ مولانا سید ابو النصر الحافظ الحاج رحمۃ اللہ علیہ سے فقیر نے براہ راست متعدد بار سنا ہے، وہ اپنے والد یعنی فقیر کے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے عموماً اس فقرے کو نقل کیا کرتے تھے ۱۲

"وعظ بھی نہ کہتے تھے" ص۱۳

مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں حضرت والا کا یہی طرز عمل تھا امیر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے بھی ارواح میں نقل کیا ہے کہ

"مولانا نانوتوی وعظ نہ کہتے تھے" ص۱۶۱

پھر اس طرز عمل میں تبدیلی کس راہ سے ہوئی؟ مصنف امام نے اس کی تاریخ یہ بیان کی ہے، کہ حضرت شاہ اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ جلیل، عالم باعمل حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جنھیں سیدنا الامام الکبیر غیر معمولی احترام وعزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنے اکابر میں ان کو شمار کرتے تھے[لہ]، ان ہی

"مولانا مظفر حسین مرحوم کاندھلوی نے اول وعظ کہلوایا" ص۳۱

واللہ اعلم یہ پہلا تاریخی وعظ کہاں کہا گیا؟ بظاہر کاندھلہ ہی میں شاید یہ وعظ ہوا ہو، مصنف امام ہی نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ آپ کے اس پہلے تاریخی وعظ میں

"خود (مولانا مظفر حسین نے) بھی بیٹھ کر سنا" ص۳۱

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

"اور بہت خوش ہوئے" ص۳۱

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ دنیا کو خطابت و بیان کے اس غیر معمولی نمونہ سے استفادہ کا موقعہ جو ملا مولانا

لہ اسی قو پر مصنف امام نے مولانا مظفر حسین کا ذکر غیر معمولی الفاظ میں فرمایا ہے اپنی چشم دید شہادت درج کی ہو کر اتباع سنت میں ایسا دیکھا دنا التقویٰ کا حال یہ تھا کہ مشتبہ لقمے کو معدہ قبول نہ کرتا تھا پیادہ پا سات حج سے سرفراز ہوئے۔ مدینہ منورہ میں دفن ہونے کی آرزو تھی ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء یعنی فتنۂ غدر کے سات سال بعد ان کی یہ آرزو پوری ہوئی، مدینہ میں انتقال ہوا، عقد بیوگان کی ترویج میں غیر معمولی کوشش مولانا نے کی صرف نحو کے بغیر عورتوں کو قرآن کا ترجمہ بھی پڑھایا کرتے تھے، قصباتی زبان طرز وضع کی وجہ سے متعدد مواقع میں بعض دلچسپ قصے پیش آئے راستہ میں ایک دن ایک مسافر جو بار بار کہتا تھا کہ مولانا مظفر حسین کاندھلے والے بڑے زبردست عالم اور ولی اللہ ہیں۔ آپ فرماتے کہ نہیں بھائی صرف نماز بس وہ پڑھ لیتا ہے۔ مسافر غصہ میں الجھ الجھ پڑتا آخر کسی دوسرے آنے والے نے راز فاش کیا کہ ارے یہی تو مولانا مظفر حسین ہیں، ایک ہندو آپ کی حالات سفر ہی کے زمانہ میں اپنے خاندان سمیت مسلمان ہو گیا، ارواح وغیرہ میں انکے غیر معمولی حالات درج ہیں ۱۲

دیکھا گیا تھا کہ بیان کرنے والا اپنے محبوب پیغمبر (فداہ ابی وامی) کے خلق عظیم "کو بیان کر رہا ہے سارے مجمع کو خطاب کر کے آخر میں جس وقت یہ فرمایا جا رہا تھا کہ" انصاف سے کوئی صاحب بتلائیں تو بھی اس قسم کے اخلاق کا کوئی اور شخص ہوا ہے تو دیکھا گیا کہ سننے والوں پر

"ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کے مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں بیساختہ ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت"

اور یہ حال عوام ہی کا نہ تھا، اسی میلہ کی روئداد میں ہے کہ

"پادریوں کی یہ حالت تھی کہ ششدر، بے حس و حرکت" (روئداد میلہ خدا شناسی ص۲۷)

بنے ہوئے تھے، اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ ان ہی پادریوں میں ایک پادری غالباً جس کا نام اینک صاحب تھا شاہ جہاں پور سے بریلی پہنچکر ایک صاحب کے آگے سیدنا الامام الکبیر کی تقریر کی دلدوزیوں کا ذکر ان الفاظ میں کرنے لگا کہ۔

اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص (سیدنا الامام الکبیر) کی تقریر پر ایمان لے آتے" ص۴۴

اسی میلہ کی تقریر سننے والوں میں سے ایک نیک دل ہندو نے اپنے احساس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

"ایسی تقریریں بیان کیں کہ پادریوں کو جواب نہ آیا کوئی اوتار ہوں تو ہوں" ص۴۴

لیکن یہ احساسات تو دوسروں کے تھے، خود حضرت والا کا اپنے وعظ و تقریر کے متعلق کیا خیال تھا حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے راوی ہیں، یعنی اس تمہیدی کلیہ کو بیان کر کے کہ

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے۔"

ایک محقق کا، اور ایک بے حیا کا"

اس کے بعد حکیم الامۃ یہ روایت کیا کرتے تھے کہ

"اور اپنی نسبت (حضرت نانوتوی) فرماتے تھے کہ میں بے حیا ہوں، اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں"

(قصص ص۱۰۳ الہادی جمادی الثانی ۵۰ھ)

بھری مجلسوں میں اس قسم کے اعترافات بھی خواہ بطور کسر نفسی ہی کیوں نہ ہوں، آسان نہیں ہیں لیکن حضرت تھانوی سیدنا الامام الکبیر کے دیکھنے والوں میں تھے، ان کی فطرت اور جبلی خصوصیات سے واقف تھے، اسی لئے مذکورہ بالا فقرے کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

"یہ تو آسان ہے کہ اظہار تواضع کے لئے ہر واعظ زبان سے یہ کہدے، مگر فرق یہ ہے کہ وہ بناوٹ سے ہوگا اور مولانا (نانوتوی) بے بناوٹ کہتے تھے۔"

مطلب یہ تھا کہ کمال کسی رنگ میں ہو، اپنی طرف اس کے انتساب کو سیدنا الامام الکبیر کی فطرت برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی، آگے اسی کے بعد حضرت تھانوی کی طرف یہ بات جو منسوب کیگئی ہے کہ

"کیونکہ ان کو (سیدنا الامام الکبیر) کو کمالات حقیقیہ کا منبع معلوم تھا، اس کے سامنے اپنے کمالات ہیچ نظر آتے تھے۔"

بہر حال اپنے تقریری کمال کے متعلق یہ احساس تو سیدنا الامام الکبیر کا تھا، لیکن دوسرے آپ کی تقریروں سے غیر معمولی طور پر کیوں متاثر ہوتے تھے اس کا سراغ بھی حضرت والاہی کے ایک حکیمانہ نکتہ کی روشنی میں لگایا جا سکتا ہے، امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح میں یہ نقل کرتے ہوئے کہ

"ایک مرتبہ کسی نے (وعظ پر) اصرار کیا۔"

شاید اس وقت طبیعت آمادہ نہ تھی، یا کیا وجہ ہوئی۔ بہر حال کہنا یہ ہے، کہ اصرار کرنے والے صاحب سے خاں صاحب کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ

"وعظ ہمارا کام نہیں اور نہ ہمارا وعظ کچھ مؤثر ہو سکتا ہے"

آگے یہ ارشاد فرمایا کہ

"وعظ کام تھا، مولانا اسمٰعیل شہید صاحب کا اور ان ہی کا وعظ مؤثر بھی تھا"

پھر آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو سمجھایا کہ تقریر و بیان کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ بطور فن کے بعض لوگ خطابت کی مشق کرنے میں موجودہ اصطلاح میں گویا یوں سمجھئے کہ آرٹ کی حیثیت سے اس کو سیکھتے ہیں۔ اور جن لوازم و ضروریات کی حاجت اس فن کے حاصل کرنے میں ہوتی ہے

کرنے والے صاحب سے کہا کہ

"کم از کم اتنا تقاضا ئے ہدایت تو ضرور ہونا چاہئے"

فرمایا کہ

"اگر اتنا بھی نہ ہو تو نہ واعظ وعظ کا اہل ہے اور نہ اس کا وعظ مؤثر ہو سکتا ہے"

آگے امیر شاہ خاں صاحب کے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا نے تقاضائے ہدایت کی اس شرط سے اپنے آپ کو بھی اور اپنے جیسے دوسرے مولویوں کو بھی محروم قرار دیتے ہوئے اصرار کرنے والے صاحب کے سامنے تقریر نہ کرنے کا عذر پیش کیا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت والا تقریر کے لئے اپنی طبیعت کو موزوں نہیں پا رہے تھے، شاید ہدایت سے زیادہ کسی دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ منعطف ہو، بہرحال آخر میں جیسا کہ امیر شاہ خاں مرحوم کی اسی روایت میں ہے کہ پھر پلٹ کر حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرنے لگے کہ

"ہاں یہ تقاضا (دوسروں کی راہ نمائی و ہدایت کا) مولوی اسمٰعیل صاحب کے دل میں پورے طور پر موجود تھا، اور جب تک وہ ہدایت نہ کر لیتے چین نہ آتا تھا" صفحہ ۱۶

اگرچہ کوئی خاص اشارہ خاں صاحب مرحوم کی روایت کے الفاظ سے نہیں ملتا، لیکن بجائے دوسروں کے ابتداء میں بھی مولانا اسمٰعیل شہید ہی کا اس موقعہ پر تذکرہ فرمانا، اور آخر میں بھی پھر ان ہی کا حوالہ دینا اس کی میرا ذہن خطابت و تقریر ہی کی افادیت و تاثیر بخشی کے ایک خاص پہلو کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے غالباً اسی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہوگا، لیکن راوی کے ذہن میں شاید اس کی چنداں اہمیت نہ تھی، اس لئے ممکن ہے کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے وعظ و بیان کے متعلق جہاں یہ نکتے ظاہر کئے گئے، کہ بعض لوگ نظرتاً بے جھجک اور غیر مرعوب دل و دماغ کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں بطور طبیعت کے اسی کیفیت کی تعبیر حضرت والا نے "بے حیائی" کے لفظ سے کی ہے۔ بہرحال اسی قسم کے لوگ بطور آرٹ اور فن کے تقریر کا پیشہ

اختیار کر لیتے ہیں، اسی طرح جن لوگوں کے قلوب پر وجدانی تقاضوں کی طرح کسی نصب العین کے اظہار واشاعت کا شدید تقاضا جب مسلط ہو جاتا ہے، اور یہی تقاضا ان کو تقریر کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اس حالت میں بات چونکہ ان کے دل سے نکلتی ہے اس لئے دلوں پر اس کی چوٹ پڑتی ہے، سننے والے اسی قسم کی تقریروں سے حقیقی معنوں میں متاثر ہوتے ہیں، قوموں اور امتوں میں فکری وعملی انقلاب اسی نوعیت کی تقریروں سے رونما ہوا ہے، جیسے ہندوستان کے پژمردہ وافسردہ بلکہ کہنے تو کہہ سکتے ہیں بصورت زندہ درحقیقت مردہ قلوب رکھنے والے مسلمانوں میں اچانک بیداری کی لہر حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں سے کسی زمانے میں جو دوڑ گئی تھی اور پشاور سے چاٹگام تک کی زمین ہلنے لگی تھی، سرفروشی اور جاں بازی کے ... میں مسلمان اپنے اپنے گھروں سے شمشیر بکف نکل پڑے تھے، تو یہ انقلابی رنگ پیشہ ورانہ مصنوعی خطابت کے زور سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ راز وہی تھا کہ پہلے آگ خود کہنے والے کے دل میں لگی، اور اپنے دل کی اسی آگ کو زبان کی راہ سے وہ دوسروں کے دلوں میں منتقل کرتا چلا جارہا تھا، جہاں تقریر و بیان کے متعلق ان دو اصولی باتوں کی طرف حضرت والا نے اشارہ فرمایا ہے، وہیں بار بار مولانا اسمٰعیل شہید کا ذکر اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ جو فرمایا گیا ہے، حالانکہ خود ولی اللٰہی خاندان میں حضرت شہید کے علاوہ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز اپنے وقت کے بہترین خطیبوں میں شمار ہوتے تھے، ان کی ہفتہ واری تقریروں کا تذکرہ اب بھی لوگ کرتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ جس دن شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ ہوتا تھا، گویا تمام دلی آپ پر سمٹ کر جمع ہو جاتی تھی، اور دور دور سے لوگ صرف آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہونے کیلئے دلی آیا کرتے تھے۔

کچھ بھی ہو حضرت شہید ہی کو تقریری میدان کے مثالی وجود کی حیثیت سے پیش کرنے ہی سے یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ شاید حضرت والا نے ادھر اشارہ کیا ہو، کہ ایسے مسائل جن کے متعلق دفعتاً جوش و خروش کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً وہی کام جو حضرت شہید کے پیش نظر تھا یعنی مسلمانان ہند کو پنجاب کے مظلوم وستم دیدہ مسلمانوں کی نجات وخلاصی کے لئے آپ آمادہ کرنا چاہتے تھے،

کہ شرم و حیا کے کمالات سے محرومی کا یہ نتیجہ ہے۔ یہی خود بھی سمجھتے تھے اور اعلانیہ بھری مجلسوں میں لوگوں کے سامنے بقول حضرت تھانوی بغیر کسی تصنع کے اپنی اس بے کمالی کا اظہار کیا کرتے تھے اور تقریر کی وہ قسم جس کا منشا مقرر کی بے حیائی ہو، اس کے مقابلہ میں تقریر ہی کی دوسری قسم کے مقررین کو آپ "محقق" کے نام سے موسوم کرتے تھے، حضرت والا کا خود اپنے متعلق جو خیال بھی ہو، لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں، ریاست رامپور والی تقریر اور اس مجلس کو سوچتا ہوں جس کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقعہ پر میں نقل کر چکا ہوں کہ

"شہر کے امرار، رؤسار، علمار، عمائد شہر، طلبار غرضکہ ہر طبقہ کے لوگ بھر گئے تھے"

اور یہ کہ

"تمام مشاہیر علمار سوائے مولوی عبد الحق صاحب خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے مگر بولنے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی" (ارواح ص ۱۹۹)

تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ "محقق والی تقریر" کے نام سے آخر تقریر و بیان کی کس قسم کو موسوم کیا جائے، غیر مسلم تک جن تقریروں کو سن سن کر کہتے ہیں کہ تقریروں ہی کی بنا پر اگر آدمی مسلمان ہو سکتا تھا تو میں مسلمان ہو جاتا، یا "اوتار" تک تسلیم کرنے کے لئے جس کی تقریریں لوگوں کو آمادہ کر دیتی ہوں، بتایا جائے کہ "تحقیقی تقریر" کے سوا وہ اور کیا ہو سکتی ہے۔[لہ]

لہ امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح میں یہ قصہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ حضرت نانوتوی کی مجلس وعظ میں ایک دفعہ مشہور معقولی عالم مولنا احمد حسن بھی شریک تھے غالباً یہ امروہی نہیں بلکہ مولانا احمد حسن کانپوری مرحوم ہیں، جو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ مثنوی معنوی پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کو اپنے الفاظ میں مولنا کانپوری ہی نے ڈھالا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ مطبع نامی کانپور سے مثنوی کا یہ نسخہ شائع ہوا، بہر حال کہنا یہ ہے کہ مولنا احمد حسن کو دیکھ کر حضرت نانوتوی کی توجہ اسلام کے ان مسائل کی طرف ہو گئی، جن میں قدیم عقلیات کی بنیاد پر اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت مولنا کی زبان سے عجیب و غریب عقلی نکات و حقائق ادا ہو رہے تھے کہ مولنا احمد حسن جو علمار دیوبند سے حسن ظن نہیں رکھتے تھے بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ اکبر یہ باتیں کسی انسانی دماغ کی نہیں ہو سکتیں یہ تو خدا ہی کی باتیں ہیں پھر اپنی اثر پذیری کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ مجھ پر تو یہ اثر ہوا کہ میری خودی مٹ رہی ہے ۱۲ ص ۱۸۱ ارواح

لیکن خود تقریر کرنے والا اپنی ان ہی تقریروں کو اپنی بے کمالی کی دلیل خود بھی سمجھتا رہا اور دوسروں کو بھی بغیر کسی تصنع کے یہی سمجھاتا رہا۔ سوال یہی ہے کہ آخر یہ قصہ کیا تھا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ بھنک بھی مقرر صاحب کو اس کی لگ جاتی ہے کہ کسی نے ان کی تقریر یا ان کے وعظ کو پسند نہ کیا، یا ستائش و مدح کے الفاظ سے اپنی زبان کو تر کرنے کی سعادت غریب سننے والا حاصل نہ کر سکا، تو ساری شقاوتوں اور بدبختیوں کا مرجع واعظ صاحب کے نزدیک بن جاتا ہے، عام حال دنیا کا یہی ہے، مگر اسی دنیا میں پیدا کرنے والے نے اسے بھی پیدا کیا تھا، جسے اپنے ہر کمال کے نیچے بے کمالی جھانکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

اللہ اللہ فیاض ازل کی طرف سے جس کی سرفرازیوں کا یہ حال ہو، شاید کہیں پہلے بھی ذکر آچکا ہو کہ جس وقت تقریر کرنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر کھڑے ہوتے اور بیان شروع ہو جاتا تو دیکھا جاتا تھا کہ بیچ بیچ میں کبھی خاموش ہو جاتے ہیں، رکنے کے بعد پھر آگے بڑھتے ہیں۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی، تو فرمایا کہ

"ایک ہی مضمون کے بیسیوں پیرائے اور عنوان ذہن میں ایک دم آتے ہیں، تو طبیعت رک جاتی ہے اور میں اس پر غور کرنے لگتا ہوں کہ کس کو لوں اور کس کو چھوڑ دوں" ص ۱۹۶ ارواح

لیکن باوجود اس کے وہ یہی کہتا رہا کہ

"میں بے حیا ہوں اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں"

اس میں شک نہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کے تقریری مجاہدات کے چرچوں سے جیسے ہندوستان تقریباً نصف صدی سے زیادہ مدت سے اب بھی گونج رہا ہے، اسی طرح آپ کی تحریری خدمات کا بھی کافی ذخیرہ بحمد اللہ محفوظ ہے، لیکن جو روداد حضرت والا کی وعظ گوئی کی لوگوں نے بیان کی ہے، کچھ ایسا ہی رنگ آپ کے تصنیفی کاروبار کا بھی معلوم ہوتا ہے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں ایک موقعہ پر حضرت والا کے مصنفات کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

"اگرچہ مجموعہ ان کا کثیر ہے" ص ۲۲

یہ خبر جو دی ہے کہ

"مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے اس عرصہ میں چند تحریرات کیں۔ بعضی جواب کسی سوال کے بعض فرمائش کسی دوست کے بعض اتفاقیہ"۔

اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے، پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں، تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کی نوعیت وہ نہیں ہے جو پیشہ ور مصنفین کی ہوتی ہے، بلکہ وہی بات کہ کسی نے تحریراً کچھ پوچھا خصوصاً ایسی بات جس کا تعلق اسلام کے اصول سے ہوتا، تو کبھی کبھی آپ نے ان ہی سوالات کے جواب میں کچھ ارقام فرما دیا۔ یا بعضوں نے کسی خاص مسئلہ پر لکھنے کی خصوصی فرمائش کی، اصرار سے مجبور ہو گئے، اور قلم ہاتھ میں لے لیا، اور اتفاقاً ایسا بھی ہوا ہے کہ لکھ کر اپنے خیالات کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی، مثلاً شاہ جہاں پور کے میلہ کے متعلق تحریریں یا رڑکی والے مناظرے کے سلسلے میں مشہور کتاب "قبلہ نما" وغیرہ کا یہی حال ہے؛

کچھ بھی ہو مستقلاً تصنیف کا ارادہ کر کے جہاں تک میری معلومات ہیں، کوئی خاص کتاب آپ نے نہیں لکھی[1]۔

آپ کے تحریری مآثر کے متعلق مصنف امام نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے اسی کتاب میں یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جو تحریریں ناتمام رہ گئیں، اب بھلا کون اُن کو تمام کر سکتا ہے اور جن میں کچھ نقصان ہو گیا، ان کی تکمیل کی کیا صورت ہو سکتی ہے"۔ ص ۱۵

کتابوں کے نقص اور ناتمام رہ جانے کی وجہ بھی وہی ہے کہ مصنف بننے کے لئے آپ نے تحریر کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا، وقتی محرکات اور بیرونی دباؤ سے متاثر ہو کر وقت پر جو کچھ لکھا گیا، لکھ دیا پھر اس کی تکمیل کا خیال نہ آیا؛

---

[1] رد شیعہ کے سلسلہ میں ہدیۃ الشیعہ لکھتے وقت چونکہ وراثت نبوی کی بحث سامنے آئی جو موت سے متعلق ہے تو آپ نے حیات نبوی اور نفی وراثت نبوی پر ایک مستقل رسالہ آبحیات تحریر فرمایا۔

اسی طرح تصنیف کی صورت سے تقریر دلپذیر تصنیف فرمانی شروع کی جو درمیان ہی میں رہ گئی، جیسا کہ مجھ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ محمد طیب

"اگر پسند خاطر خدام والا مقام افتادہ فہو المراد ورنہ کالائے زبوں بریش خاوند،

نامۂ سیاہ خود بار خواہم گرفت" (فیوض قاسمیہ صـ۲۴)

اس میں شک نہیں جیسا کہ پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ بطور کسر نفسی کے اس قسم کے الفاظ دوسروں کی تحریروں میں مل سکتے ہیں، عام طور پر اس کو لوگ تصنع پر محمول کرتے ہیں، لیکن حضرت والا کی کتابوں میں اس قسم کی چیزوں کا ذکر کیا ہی گیا ہے کچھ ایسے سیدھے سادے بے ساختہ انداز میں کہ بناوٹ کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا، دیباچہ یا خاتمہ ہی میں نہیں، بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ لکھتے چلے جارہے ہیں، لکھتے لکھتے پھر اپنی نایافت کا شعور بیدار ہوتا ہے اور قلم سے اسی قسم کے الفاظ کتاب کے درمیانی مقامات میں نکل پڑتے ہیں، حضرت والا کی تصنیفات میں ایک "فائق تصنیف" "آب حیات" بھی ہے اس کے دیباچہ میں تو خیر جو کچھ لکھا ہے وہ لکھا ہی ہے۔ لیکن اسی کتاب کے صـ۲۲۲ میں ایک موقعہ پر پھر خیال آگیا، ارقام فرماتے ہیں۔

"اپنے حال کو کون نہیں جانتا، نہ ذہن ہے، نہ فہم ہے، نہ محنت، نہ مشقت، نہ فرصت ہے، نہ فراغت، نہ علم در سفینہ، نہ علم در سینہ" صـ۲۲۲

اپنے حال کا خود اپنے آپ کو واقف قرار دے کر اپنی تہی دامانیوں کا برملا، صرف اظہار نہیں بلکہ اس کو بھی موقعہ موقعہ سے تصنیفات کی ابتداء میں بھی، انتہا میں بھی بیچ میں بھی درج کرتے چلے جانا، اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہئے کہ کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ حضرت والا نے کتابیں بھی لکھی ہیں، اور آپ کے مقالات و مضامین بھی فارسی اردو اور قدرے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن بجائے خود ان میں سے ہر ایک اپنے نظریات فائقہ کے لحاظ سے کچھ بھی ہو، لکھنے والے نے ان کو بے کمالی ہی کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہا، جہاں بھی موقعہ ملا ہے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی مصنوعی نہیں بلکہ واقعی کوشش کی گئی ہے۔ شاید تصنیف و تالیف کی دنیا کا یہ واقعہ اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

اور جیسے ان کتابی سفینوں میں اتفاقاً سیدنا الامام الکبیر کے بعض الہامی علوم اور ذہنی افکار

دخیالات محفوظ ہو جانے کا نظم قدرت کی طرف سے ہوا، خود تو وہ کچھ لکھنا نہ چاہتے تھے، لیکن حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بہر حال ان کو لکھنا ہی پڑا، میرا خیال ہے کہ تقریباً یہی حال ان زندہ ہستیوں کا بھی ہے جو حضرت والا کے بعد آپ کے علوم کے امین: محافظ یعنی آپ کے شاگردوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دیوبندی سلسلے کے مدارس اور تعلیم گاہوں کا طویل الذیل سلسلہ آج ہندوستان کے شمال و جنوب مغرب و مشرق میں جو پھیلا ہوا ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب کی انتہا بالواسطہ یا بلا واسطہ سیدنا الامام الکبیر کے وجود باجود ہی پر ہوتی ہے، ان مدارس کا خیال ہی کوئی حضرت والا کے تصور کے بغیر نہیں کر سکتا، تقریباً ایک صدی سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کا طوفان اس ملک میں جو امڈا ہوا ہے، سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ابتدائی سرچشمہ اس کا آپ ہی کی ذات مبارک ہے۔

لیکن کیا کیجئے کہ اسی ذات ستودہ صفات کے متعلق تاریخ ہی کی شہادت یہ بھی ہے، کسی بیرونی گواہ کی نہیں صاحب البیت حضرت والا کے حفید رشید و سعید حضرت مولانا محمد طیب صاحب اپنے ایک مقالہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے۔

"نہ دار العلوم کے احاطہ میں بیٹھ کر کبھی پڑھایا نہ اس کے انتظامات کے سلسلہ میں رسمی طور پر کبھی کوئی عہدہ قبول کیا"

پھر اسی کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہ بظاہر دار العلوم دیوبند کے انتظامی تعلق سے حضرت والا تعلق نہیں رکھتے تھے مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

"احاطہ مدرسہ میں بیٹھ کر مدرسوں کی طرح کبھی درس بھی نہیں دیا" (ص ۱۳ مقالہ سیدنا الامام الکبیر کی سیاسی خدمات)

صرف یہی نہیں بلکہ جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب تک دلی میں حضرت والا کا قیام رہا نہیں جانتا کہ وہاں کسی کو آپ سے پڑھنے کا موقعہ کبھی ملا اور ہمارے مصنف امام نے حضرت والا کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت اپنی

مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس، جن کو میں قطعاً نہ سمجھ سکا، میں نے عرض کیا کہ کچھ نازل ہو کر تقریر فرمائیے میں قطعاً نہیں سمجھا، پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو اس سے کچھ نازل تھی، جس کے لفظ مانوس تھے، مگر معانی قطعاً بلند، اور غیر مانوس جن کو میں نہ سمجھا، تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں نہیں سمجھا، کچھ اور نازل ہو کر فرمائیے، پھر اس سے اتر کر اور نازل تقریر فرمائی، جو کچھ قریب الفہم آگئی تھی، مگر پھر بھی نہ سمجھا اور میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا، تو فرمایا کہ مولنا پھر کسی دوسرے وقت پوچھیے گا" ص۱۹۷

ظاہر ہے کہ مولنا محمد یعقوب جیسے ذہین و فطین، عالم متبحر جن کے مطالعہ کے ذوق کا حال حضرت تھانوی نے یہ بیان کیا ہے کہ ہر فن کا ان کو شوق تھا، خود ان ہی کا لطیفہ حضرت تھانوی نقل کرتے تھے کہ طلبہ کو خطاب کر کے فرماتے

"میاں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہیے، اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی" (قصص ص۱۱ حسن العزیز)

اور یہی غیر معمولی حال ان کی ذکاوت و ذہانت کا بھی تھا، حضرت تھانوی ہی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب کی حسّی ذکاوت کی یہ کیفیت تھی کہ

"کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ چادر اوڑھ لے تو اس کو سونگھ کر بتا دیتے کہ مرد نے اوڑھی ہے یا عورت نے" قصص ص۲۰ حسن العزیز)

بہر حال مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں بآسانی یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے پڑھنا آسان نہ تھا، وہی کتاب حضرت والا سے پڑھنے والے پڑھ سکتے تھے جس کے مطالب کو پہلے سے وہ سمجھے ہوئے ہوں، مصنف امام کی اس خبر کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ پڑھی ہوئی کتابوں ہی کو لوگ آپ سے پڑھ سکتے تھے، دوسرے لفظوں میں حاصل اس کا یہی ہوا کہ طالب العلم دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر فارغ التحصیل ہو چکنے کے بعد حضرت والا کی باتوں کے سمجھنے کے لائق ہوتا تھا اور وہ بھی بایں شرط کہ بذات خود وہ "طباع" بھی ہو، اد

طرزِ عمل کا تربیت میں دخل ہوا، اور شخصی تربیت باقی نہ رہی، جب ہی وہ احاطہ بھی بے عمل یا بے روح بن گیا"

بہرحال اس عام تجربی حقیقت کا اظہار فرمانے کے بعد مولنا طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی یہ اطلاع دی ہے کہ

حضرت (سیدنا الامام الکبیر) کو جہاں علم کی ترویج اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ عام منظور تھی وہیں اپنے مخصوص جذبات و دواعی، اور مخصوص رنگ اخلاق و عمل سے تربیت دیکر ایک خاص جماعت بھی بنانی تھی اسی لئے ایک طرف تو تعلیمی ادارہ قائم فرمایا (یعنی دار العلوم دیوبند) جس کے اصول اساسی میں عمومیت اور طریق عمل میں ہمہ گیری و وسعت رکھی، اس کے لئے شورائی حلقہ تجویز فرمایا، اور اس کے احاطہ میں اہل علم و فضل کی ایک جماعت لاکر بٹھادی۔

اسی کے بعد وہی ارقام فرماتے ہیں کہ

اور دوسری طرف تربیت خاص کی حد تک اپنی ذات گرامی کو مرکز بنایا، مخصوص طالب اور افراد اپنے لئے چھانٹ لئے، تربیت کی جگہ بھی تعلیمی احاطہ سے الگ رکھی، چھتہ کی مسجد کا حجرہ اپنے لئے مختص فرمایا، اور ان مستعد طالبوں کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھ کر انھیں اپنے رنگ میں رنگا" (مقالہ مخطوطہ ص ۱۵)

جس ضرورت کے احساس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہ یہی ضرورت تھی، اور "مدرسہ نمی رفت ولے برندش" والی مشہور ضرب المثل کا تعلق اگرچہ اس طفل سے تھا، جو پڑھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بہرحال بے چارے کو لوگ مدرسے لے گئے تھے لیکن تاریخ ہی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ پڑھنے والا نہیں بلکہ پڑھانے والا پڑھانا نہیں چاہتا تھا، اور گو "اصطلاحی مدرسہ" میں پڑھانے کے لئے وہ پھر بھی داخل نہ ہوا لیکن یہ ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ بنا جس مدرسہ کے لئے مقدر تھا، اسی کے پڑوس کی مسجد کے ایک حجرے میں درس دینے پر مجبور ہونا پڑا، یہ قصبہ دیوبند کی مشہور تاریخی مسجد چھتہ والی مسجد تھی، جس کی

ایک حجرے کو حضرت والا کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا، مولٰنا محمد طیب صاحب اپنی سیاسی مقالہ میں اسی حجرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"حضرت کی درسگاہ اور تربیت گاہ، اور جائے قیام چھتہ کی مسجد کا ایک حجرہ تھا جو ابتک محفوظ ہے۔" ص۱۳

آگے اسی کے بعد وہی رقمطراز ہیں کہ

اسی میں روز و شب گذارتے تھے۔ اور اسی میں علمی افاضہ، اور باطنی توجہات کا بازار گرم تھا، شاگرد اپنے لئے مخصوص منتخب فرمائے تھے"

مولانا محمد طیب صاحب کے قلم پر بے ساختہ اس موقعہ پر یہ فقرہ بھی آگیا ہے کہ

"بلکہ بجانب اللہ ان ...... (سیدنا الامام الکبیر) کے لئے مخصوص کردئے گئے تھے"۔

سچ پوچھئے تو جہاں تک خاکسار کا خیال ہے واقعہ کی حقیقی صورت حال بھی کچھ یہی معلوم ہوتی ہے، اجتبائی رنگ والوں کے ساتھ "اللطیف الرحیم" کے الطاف خفیہ کا ظہور ان ہی شکلوں میں ہوتا ہے،

بہرحال مولانا طیب صاحب نے ان ہی چیدہ و برگزیدہ معدودے چند طلبہ کی خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

"بجائے خود ذکی مستعد طالب حق، اور علم دین میں فنائیت کے جذبات رکھتے تھے"

ان میں سے چند کے نام کی تصریح بھی مولانا نے فرمائی ہے، لکھتے ہیں کہ

جیسے حضرت اقدس شیخ الہند مولٰنا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دار العلوم دیوبند، حضرت اقدس مولانا احمد حسن محدث امروہی، حضرت اقدس مولٰنا عبد العلی صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محی الدین مرادآبادی قاضی ریاست بھوپال، مولٰنا عبد الحق صاحب پور قاضوی وغیرہ وغیرہ"

لیکن وغیرہ وغیرہ" کے الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے تلامذہ کا دائرہ وسیع تھا جہاں تک میں جانتا ہوں، مذکورہ بالا بزرگوں کے سوا بمشکل مولانا حکیم عبد الرحیم بجنوری، مولٰنا

علیہ کے حوالہ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

"حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آب حیات حضرت مولٰنا نانوتوی کی تصنیف) وغیرہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے" ص۱۹۷

"وغیرہ" کا لفظ روایت میں جو ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سبقاً سبقاً پڑھنے کا یہ قصہ کچھ آب حیات ہی کی حد تک محدود نہ تھا، اگرچہ اسی کے ساتھ نصابی کتابوں کے پڑھنے کا ذکر بھی بعض لوگوں نے کیا ہے۔ مثلاً مصنف امام نے ارقام فرمایا ہے کہ حدیث مولٰنا محمود حسن صاحب نے سیدنا الامام الکبیر سے پڑھی تھی، یا مولٰنا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی مرحوم لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے

مجھکو ملا جلال اول سے آخر تک پڑھایا" ص۱۸۶ مذہب منصور

ان ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ ملا جلال کے پڑھنے کا موقعہ ان کو اس زمانہ میں ملا جب حضرت والا کا قیام نانوتہ میں تھا اور اس زمانہ میں علاوہ ان کے

"مولوی محی الدین احمد خاں صاحب مرادآبادی اور مولوی عبدالعلی صاحب میرٹھی اور مولوی رحیم اللہ بجنوری حاضر تھے، میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا"

مولانا منصور علی خاں صاحب نے اپنے جن تین رفقاء کا ذکر فرمایا ہے، ان میں سے تیسرے صاحب یعنی حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری کی قدم بوسی اور لقاء کی سعادت فقیر کو بھی میسر آئی ہے، مجھے یاد آتا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "رامپور کے علمی حلقوں میں درس نظامیہ کی تکمیل کرنے کے بعد وہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، واللہ اعلم ان بزرگوں کو کن کن کتابوں کے پڑھنے کا موقعہ حضرت والا سے ملا، ایک روایت مولٰنا حکیم رحیم اللہ بجنوری ہی کے متعلق بعض تحریری وثائق میں نظر سے گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری کے درس میں بھی وہ شریک تھے۔[لہ]

لہ سیدنا الامام الکبیر کے حفید ثانی مولانا قاری محمد طاہر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی قلمی یادداشت میں خاکسار کو یہ روایت ملی ہے، قاری صاحب نے لکھا ہے کہ براہ راست حکیم رحیم اللہ صاحب نے بجنور میں اس واقعہ کا ان سے تذکرہ کیا تھا کہ جب مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے میں بھی اس میں شریک ہو گیا (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

بہر حال کہنے کی حد تک تو یہی کہا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا حضرات سیدنا الامام الکبیر کے شاگرد تھے، اور حضرت والا ان بزرگوں کے استاد تھے۔ دوسرے ہی نہیں، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا دستور بھی تھا کہ سیدنا الامام الکبیر کا ذکر ہمیشہ التزاماً استاذ[1] علیہ الرحمۃ کے لفظ سے فرماتے بارہا خاکسار نے ان سے یہی تعبیر سنی ہے۔ لیکن جہاں تک واقعات کی شہادت ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاگردی اور استاذی کے عام تعلقات کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر سے ان بزرگوں کے تعلق کی نوعیت نرالی تھی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جہاں یہ فرمایا کرتے، اور دوسرے بھی یہی سمجھتے[2] تھے کہ سیدنا الامام الکبیر سے گویا ان کو عشق تھا، میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا ہے تو شاید براہ راست شیخ الہند ہی سے یہ بات فقیر نے سنی ہے کہ ابتداء میں دار العلوم دیوبند میں میرا تقرر مدرسی کی خدمت کے لئے ہوا، اور اس کی خبر مجھے ملی تو میں روپوش ہو گیا، حضرت الاستاذ کو جب اس کی خبر ہوئی تو تلاش کر کے حاضر کیا گیا، پوچھا گیا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۴) ایک دن اتفاقاً مجھے وضو نہ تھا اور سبق میں جا کر بیٹھ گیا، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت ہاتھ سے منع فرما رہے ہیں، پھر بلا کر یوں فرمایا کہ

"میاں صحیح بخاری میں تو ایسا نہ چاہئے کہ بلا وضو بھی آدمی بیٹھ جائے"

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) ۱؎ سلف کا عام طریقہ شیخ کو استاذ کے لفظ سے تعبیر کرنے کا تھا غالباً اسی عنوان پر حضرت شیخ الہند رحؒ نے جو حضرت والا کو استاد سے تعبیر کیا ہے، ورنہ جہاں شیخ الہند کے علوم ظاہری کی تکمیل حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے فرمائی وہیں کمالات باطنی کی تکمیل بھی حضرت ہی نے فرمائی ہے چنانچہ میں نے اپنے متعدد اکابر سے سنا ہے کہ شیخ الہند کا رنگ باطن اور انداز اخلاق و کمالات بعینہٖ اپنے استاذ جیسا تھا لیکن حضرت نانوتوی تواضعاً متوسلین کی تکمیل فرما کر انھیں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل فرما دیا کرتے تھے کہ اجازت ان سے لیں تو شاید اسی انداز پر حضرت شیخ الہند رحؒ کو بھی گنگوہ کی طرف منتقل فرمایا ہے۔ بسا اوقات فتاوی میں بھی یہ صورت اختیار فرمائی ہے، کہ فتویٰ خود مرتب فرمایا، اپنے دستخط کے بجائے اسے بھیجدیا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ ان کی طرف سے جانا چاہئے، غرض کمال تواضع سے طبیعت ثانیہ یہ بنالی تھی کہ ہر موقع پر کام میں سب سے آگے رہنے کے باوجود نمود کے موقع پر خود سے پیچھے رہنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ اس قسم کا واقعہ متن میں پہلے گذر بھی چکا ہے۔ نیز افتاء و تدریس و وعظ سب میں یہی رنگ طبیعت نمایاں تھا اور یہی رنگ دائرہ طریقت میں بھی متوسلین کے ساتھ استعمال فرمایا گیا ہے۔ (محمد طیب غفرلہٗ)

۲؎ ارواح میں امیر شاہ خاں مرحوم کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ مولانا محمد قاسم کے خدام آپ کے عاشق تھے (ارواح ص ۲۰۲)

بھائی یہ تم روپوش[1] کیوں ہوگئے، شیخ الہند فرماتے تھے کہ تب آبدیدہ ہو کر میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی خدمت میں فقیر تحصیل علم کے لئے کب حاضر ہوتا تھا، مجھے تو آپ کی باتوں میں صرف مزہ ملتا تھا، بس اسی مزے کے لئے حاضر ہوتا تھا، پڑھنے کے لئے پڑھتا تو مجھے کچھ آتا جاتا، ایسی صورت میں دوسروں کو بھلا کیا میں پڑھا سکتا ہوں، فرماتے تھے کہ میری باتوں کو سنکر حضرت نے مجھے قریب بلایا اور کمر کو تھپک کر ارشاد فرمایا کہ

"جاؤ! جاکر پڑھاؤ"

شاید یہ بھی فرمایا کہ تم تو بہت پڑھاؤ گے، حضرت شیخ الہند کہتے تھے کہ اسی توجہ کا نتیجہ ہے کہ "ہم جیسے کانوں کتروں[2] سے کچھ کام بن آیا" اسی کے ساتھ حضرت شیخ الہند ہی کے اس بیان کو ملایئے جس کا ذکر ارواح میں کیا گیا ہے، حاصل جس کا یہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے قلبی تعلق کا حال ان کے ساتھ یہ تھا کہ "دن میں دس بار بھی حاضر ہو کر سلام کرتا، تو مجھے دیکھ کر ہر مرتبہ اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنا کہ ماں باپ کو اس اکلوتے بچے کے ملنے سے غیر معمولی خوشی ہوسکتی ہے جو کسی وجہ سے حبس دوام کی سزا پاکر ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا گیا ہو، اور وہی لڑکا جس کے ملنے سے زندگی بھر کے لئے ماں باپ مایوس ہو چکے ہوں قید سے چھوٹ کر ان کے پاس حاضر ہو جائے۔ ارواح ص۱۸۵

---

[1] بعض روایات کے مطابق یہ واقعہ کافیہ پڑھانے کے زمانہ کا ہے یعنی مدرسی پر مامور ہونے کے بعد پڑھانا شروع کر دیا تھا اور ابتدائی کتب مثل میزان منشعب وغیرہا کا درس دیتے رہے لیکن کافیہ شروع ہونے پر جب خود یہ اندازہ کیا کہ وہ چل نہ سکے گی تو اسے شروع کرائے بغیر پڑھانا چھوڑ کر روپوش ہو گئے اس پر حضرت والا نے بلوا کر وہ جملے ارشاد فرمائے جو متن میں مذکور ہوئے ہیں۔ ...... (محمد طیب غفرلہٗ)

[2] کانوں کتروں کے الفاظ اب تک معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ میں تازہ ہیں، شیخ الہند نے کچھ عجیب انداز میں یہ بات فرمائی تھی، توجہ کی شاید یہ وہی قسم ہے جس کی تعبیر شیخ محی الدین بن عربی توجہ بالیدے اپنی کتابوں میں کرتے ہیں مشہور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ البجلی گھوڑے کی پشت پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی توجہ بالیدہی کی بدولت میخ کی طرح جم جاتے تھے حالانکہ اس سے پہلے گھوڑے کی پیٹھ پر ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوء حفظ کی شکایت جب کی تو ان کو بھی توجہ بالیدہی سے سرفراز فرمایا گیا جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں ہے۔ ۱۲

اٹھائی جاتی تھیں، وہیں محدث امروہوی یہ بھی فرماتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ جس طالب العلم کے اندر تکبر دیکھتے تھے اس سے کبھی کبھی جوتے اٹھوایا کرتے تھے" ص ۲

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ خود اپنی بیتی کا بیان کرتے تھے تفصیل آپ کو ارواح ثلاثہ میں ملے گی واقعہ یہ تھا کہ محدث امروہوی جو امروہہ کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، اور ناز و نعمت میں پلے ہوئے تھے، حضرت والا کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو کہتے تھے میں نے دیکھا کہ ایک جولاہہ نے حضرت سے دعوت قبول کرنے کی فرمائش کر کے عرض کیا کہ فقیر کے غریب خانہ کو رونق بخشی جائے اس زمانہ میں مسلمانان ہند کی ذہنیت شرافت و رذالت کی گھناؤنی گندگیوں سے اس حد تک مائوف ہو چکی تھی، کہ غریب جولاہہ کے گھر جا کر کھانا کھانے کی درخواست کی منظوری سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جس وقت صادر ہوئی، تو مولانا احمد حسن کا بیان ہے کہ

"مجھکو اتنا ناگوار ہوا کہ جیسے کسی نے گولی ماردی"

مگر تلاوت آیات و تعلیم حکمت کے ساتھ ساتھ اِن لوگوں کے تزکیہ کا کام بھی سیدنا الامام الکبیر کے سپرد ہوا تھا، اسی وقت سے مولانا احمد حسن کے اندر اُترنے والی اس گولی کی طرف سے فکر پیدا ہوگئی، فراست ایمانی سے حضرت والا نے مولانا امروہوی کے اس تاثر کو بھانپ لیا کہتے تھے کہ اس دن کے بعد سے یہ قاعدہ ہی حضرت نے مقرر کر لیا کہ دعوت کرنے والوں سے یہ شرط بھی کرتے کہ مولوی احمد حسن کو بھی میں ساتھ لاؤنگا پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کو کس کس کے گھر جانا پڑا، اور بقول ان ہی کے

"جب بالکل میرے قلب سے ناگواری نکل گئی تب مولانا نے میری دعوت کی شرط کو ترک کر دیا" ص ۲

اور یوں دل میں ان کے جو گولی اتر گئی تھی اس کو نکال کر تزکیہ کے فرض کو انجام تک حضرت والا نے پہونچایا، اور تزکیہ کا یہ قصہ صرف مولنٰنا احمد حسن ہی تک محدود نہ تھا، کسی موقعہ پر صاحبزادہ والا تبار مولنٰنا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے حوالہ سے مولنٰنا منصور علی خاں صاحب مرحوم کے صوری ابتلاء و افتتان کے حادثہ کا ذکر کر چکا ہوں، اس موقعہ پر بھی جو کچھ کیا گیا تھا، وہ تزکیہ ہی کی تو ایک عملی شکل تھی،

مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ جن کے متعلق حضرت تھانوی یہ روایت نقل کیا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر فرماتے تھے کہ مولوی احمد حسن کے دل و دماغ، ذکاوت و ذہانت کو میری طبیعت سے خاص مناسبت ہے، فرماتے کہ ذہین و فطین تو ممکن ہے لوگ ان سے بھی زیادہ ہوں لیکن سونے کی مقدار تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، سونے کے ڈھیر سے جو مناسبت اس کو ہوگی، وہ چاندی کو نہیں ہوسکتی، خواہ چاندی کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو (قصص ماہ جمادی ۸۳ھ)

بہرحال ان ہی باطنی مناسبتوں کی وجہ سے مشہور ہے کہ حضرت سیدنا الامام کے قلب مبارک میں ان کی خاص جگہ تھی، اور بقول مرشد تھانوی سید ہونے کی خصوصیت کو بھی اس میں دخل تھا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے تزکیہ کے فرض کا جب مطالبہ ہوتا، تو اس مطالبہ کی تکمیل میں کبھی ان کی رو و رعایت نہیں کی گئی، دعوت والی گولی کا قصہ تو آپ سن ہی چکے، مولنا احمد حسن صاحب ہی اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے، عرض کر چکا ہوں کہ مولنا احمد حسن کی پرورش ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی تھی، وہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ "میں بڑا خوش لباس تھا" اب سنئے اسی "خوش لباسی" کے جذبہ کا حشر، ارواح میں ان ہی کا یہ بیان درج کیا گیا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں کسی نے گاڑھے کا ایک تھان پیش کیا، قبول کر لیا گیا، اور درزی کو بلوا کر حکم دیا گیا کہ ایک انگرکھا تو میرا اس سے تیار کر دو، اور اسی کے ساتھ ان کو (یعنی مولنا احمد حسن) کو بلا کر درزی سے فرمائش کی گئی، کہ دوسرا انگرکھا ان کے لئے اسی کپڑے سے نکالو، کپڑا کافی تھا، درزی دونوں انگرکھے سی کر لے آیا۔ مولوی احمد حسن صاحب کے حوالہ گاڑھے کا وہی انگرکھا یہ ہدایت کرتے ہوئے کیا گیا کہ اسے تم پہنو، "خوش لباسی" کے جذبہ کی خوراک گاڑھے کے اس انگرکھے کی شکل میں مہیا کی گئی تھی، مولانا احمد حسن صاحب نے لینے کی حد تک تو لے لیا۔ مگر بجائے پہننے کے اس کو صندوق کے حوالہ کیا، کہتے تھے جب اس انگرکھے کو پہن کر حضرت کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، تو وجہ پوچھی گئی، کوئی وقتی عذر پیش کر دیا گیا، مگر یہ فرمائش اتفاقی تو تھی نہیں جو ان حیلوں حوالوں سے ٹل جاتی۔ مولنا احمد حسن فرماتے تھے کہ

"مولانا روز دریافت فرماتے کہ بھائی، تم نے اس کو پہنا نہیں آخر جب میں سمجھ گیا
کہ مولانا مانیں گے نہیں تو مجبوراً میں نے اس کو پہنا" (ارواح ص۲۰)

اور اس قسم کے قصوں کی حضرت والا کی زندگی میں کیا کمی ہے، افسوس ہے کہ لوگوں نے قلم بند نہیں کیا
ورنہ تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم وتزکیہ کے دھارے ایک ساتھ جو بہ رہے تھے، ان کے بہترین
عملی نمونے یہ واقعات ہو سکتے تھے۔

تاہم میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں غالباً اس کے سمجھنے کے لئے یہی چند مثالیں کافی ہو سکتی ہیں،
آخر آپ ہی سے میں پوچھتا ہوں، مولانا احمد حسن امروہوی کی طرف یہ روایت جو ارواح میں منسوب
کی گئی ہے کہ شاہ جہاں پور والے مشہور میلہ کی معرکۃ الآرا تقریر سیدنا الامام الکبیر نے جو کی تھی شہر
شاہ جہاں پور کے باشندوں نے جب اس کی غیر معمولی تعریفیں سنیں، تو میلہ سے حضرت والا جب
شاہ جہاں پور تشریف لائے، شہر کے معززین کا ایک گروہ حاضر ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ ہم لوگ
اس تقریر کے سننے سے چونکہ محروم رہے، اس لئے وہی تقریر یہاں بھی فرمائی جائے۔ حضرت والا
نے ان لوگوں کے غیر معمولی اصرار کو دیکھ کر فرمایا کہ اس تقریر کو آپ لوگ اگر سننا چاہتے ہیں تو
ان سے (اشارہ مولوی احمد حسن امروہوی) سے سن لیجئے۔ کہتے تھے کہ میں تو یہ سنکر کچھ ششدر سا ہو کر رہ گیا
کیونکہ حضرت والا کی تقریر کا اعادہ خصوصاً جب میں نے اس غرض سے سنی بھی نہ تھی، مجھے کچھ
ناممکن سا نظر آیا۔ لیکن سیدنا الامام الکبیر کا حکم تھا، کھڑے ہو گئے، کچھ تمہیدی فقرات کے بعد
ان کا بیان ہے کہ تقریر کا اعادہ میں نے شروع کیا۔

"پھر مجھے خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں"

لیکن جب تقریر ختم ہوئی تو میلے میں سیدنا الامام الکبیر کی براہ راست تقریر سننے والوں نے
شہادت دی کہ

من وعن وہی تقریر تھی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمائی تھی" ص۱۰۸ ؏

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

"کمسنی میں ولایت" کی شہادت، وقت کے قطب الہند حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ جن کے متعلق دے رہے ہوں، کون کہہ سکتا ہے کہ باطن کی ان راہوں سے کیا کیا سرفرازیاں ہوئی تھیں مگر سنئے، اس راہ کے کمالات کے ظہور کا جو عام ذریعہ ہے، یعنی حلقہ بیعت وارادت میں داخل کرکے لوگوں کو مرید کرنا، مصنف امام اسی کے متعلق فرماتے ہیں کہ

مولانا (محمد قاسم صاحب) باوجود اجازت حضرت صاحب مخدوم ومکرم وقبلہ ایک زمانہ تک کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے" (ص۲۱ قدیم سوانح عمری)

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرید کرنے یا کسی کو اپنی بیعت میں لینے سے انکار پر اصرار کا زمانہ کافی دراز تھا، لوگ مرید ہونا چاہتے تھے اور خشک جواب پاکر مایوس ہوجاتے تھے، انتہا یہ ہے کہ اپنے خادم خاص اور دنیاوی معاملات میں حضرت کے گھر کے گویا جو دار وغہ اور مختار کل تھے، یعنی دیوان حاجی محمد یٰسین مرحوم ان کے متعلق حضرت کے نورچشم مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم یہ لطیفہ بیان کیا کرتے تھے کہ دیوان جی نے جب بیعت ہوجانے کی آرزو ظاہر کی، تو غریب کو حکم دیا گیا کہ جاؤ مولانا گنگوہی سے مرید ہوجاؤ، دیوان حاجی یٰسین اسی وقت اٹھے اور گنگوہ پہونچ کر مولانا گنگوہی سے بیعت کرلی، مرید ہوکر سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کرنے لگے کہ اب تو میری بیعت لے لیجئے، اور اپنا مرید مجھے بنا لیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم تو مولوی رشید احمد صاحب سے مرید ہوچکے، پھر اب میں کیا مرید کروں، حاجی یٰسین نے عرض کیا کہ مولانا رشید احمد کی خدمت میں میری حاضری اور ان سے میری بیعت صرف آپ کے حکم کی تعمیل تھی ورنہ بیعت تو آپ ہی کے ہاتھ پر کروں گا، یہ تدبیر بھی ایسی تھی اور استقامت کا ایسا غیر معمولی رنگ تھا کہ حضرت والا نے مجبور ہوکر حاجی یٰسین کی بیعت لے لی (ص۱۸۶ ارواح)

اسی طرح ایک دوسرا لطیفہ اسی سلسلہ میں وہ ہے جس کا ذکر حضرت حکیم الامت تھانوی کیا کرتے تھے یہ دوسرا لطیفہ پہلے سے زیادہ دلچسپ ہے، قصص میں ہے حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"مولانا نانوتوی کی خدمت میں ایک شخص شکرے کر حاضر ہوئے، حاضرین میں وہ شکر تقسیم ہوگئی"

ایسی صورت میں سنانے والے اس قسم کے قصے جو سنایا کرتے تھے، مثلاً غریب اللہ دیا بیچارے کا قصہ ارواح ثلثہ، قصص الاکابر کے سوا سوانح مخطوطہ میں بھی جس کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس وقت سوانح مخطوطہ ہی سے ہم اس کو نقل کر رہے ہیں، دیوان حاجی محمد یٰسین جو حضرت کی خانگی زندگی کی خدمات انجام دیتے تھے، ان ہی کی روایت ہے۔

کہتے تھے کہ دیوبند میں ایک غریب آدمی الہ دیا نامی تھا، مومن برادری سے اس کا تعلق تھا، حضرت والا کا عقیدت مند تھا، ایک دن حاضر ہو کر عرض کیا کہ آج رات کا کھانا فقیر ہی کے گھر تناول فرمایا جائے، بخوشی اس غریب کی دعوت منظور کی گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ مغرب سے کچھ پہلے بارش بھی ہونے لگی، اور غریب اللہ دیا کے ساتھ خدا جانے کیا صورت پیش آئی، کہ گھر والوں کو اس کی اطلاع بھی نہ دے سکا کہ آج مولانا کی میں نے دعوت کی ہے۔ شاید کسی کام میں مشغول ہوا، اور بھول گیا۔ لیکن جو نواب کلب علی خاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی تمنائے ملاقات کو ٹھکرا سکتا تھا۔ غریب اللہ دیا کی دعوت کا خیال اپنے دماغ سے کیسے نکال سکتا تھا، بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی، مغرب کے بعد اللہ دیا کا حضرت انتظار فرماتے رہے، کہ آکر ساتھ لے جائے گا، لیکن رات گذرتی جارہی تھی اور نہ اللہ دیا کا پتہ تھا، نہ اس کی طرف سے کسی دوسرے نمائندہ کا جو بلا کر ساتھ لے جاتا۔ یہیں سے سننے کی بات ہے، دیوان حاجی محمد یٰسین کہتے تھے کہ

"حضرت نے بہت انتظار کیا کہ کوئی بلانے آئے، مگر کوئی نہ آیا"

دیوان جی صاحب کہتے تھے کہ حضرت کے انتظار کی شدت اور بارش کی شدت کو دیکھ کر حاضرین میں سے بعضوں نے عرض کیا کہ اللہ دیا کے گھر سے ہم کھانا لا کر حاضر کریں۔ شاید ان بے چاروں کو خیال گذرا کہ حضرت والا کھانے کے انتظار میں بے چین ہیں، لیکن سب پر سکتہ طاری تھا جب دیکھا گیا کہ اس کالی پیلی برسات کی رات میں برستے ہوئے پانی کے نیچے اللہ دیا کے گھر پہنچنے کے ارادہ کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ کوئی کمل ہو، تو لاؤ، بیان کیا گیا ہے کہ جیسے

گاؤں والے کمل جوٹ باندھ لیتے ہیں، آپ نے کمل کا جوٹ باندھا، جوتیاں ہاتھ میں، اوپر
سے بھی برس رہا ہے موسلا دھار پانی اور نیچے بھی گلی کوچوں میں پانی ہی پانی، پانی کے سوا کچھ نہیں
اور سیدنا الامام اسی ہیئت کذائی کے ساتھ غریب اللہ دیا کے گھر تک بہر حال پہنچ ہی کر رہے۔
اللہ دیا کو دعوت کا قصہ ہی یاد نہ تھا، دروازہ بند کئے گھر میں پڑا ہوا تھا، کہ کنڈی کے کھٹکھٹانے
کی آواز آئی، دروازہ کھولتا ہے، تو اپنی چوکھٹ پر اس کو پاتا ہے جس کی آستانہ بوسی کی آرزو دل
میں بڑے بڑے والیانِ ملک تڑپتے تھے، حاجی محمد یٰسین مرحوم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی
کو اپنے ساتھ چلنے کی بھی اجازت نہ دی، کہہ دیا گیا ہوگا کہ دعوت اس غریب نے صرف میری ہی
کی ہے، اس لئے تنہا میں جاؤں گا، بہر حال بقول حاجی محمد یٰسین

"اندھیری رات، اوپرے بارش، نیچے کیچڑ، کمل کا جوٹ باندھ جوتیاں ہاتھ میں تن تنہا
اس کے (اللہ دیا کے) مکان پر تشریف لے گئے"

دعوت تم نے کی تھی، انتظار کرتے کرتے آخر میں خود آ گیا، کچھ اسی قسم کے الفاظ نے غریب اللہ دیا
کے ہوش اڑا دیئے، اب خیال آیا کہ میں نے یہ کیا کیا، حاجی صاحب کے الفاظ ہیں کہ

"اپنے سہو پر کمال نادم ہوا، اور حاضر ہو کر گڑگڑا کر عرض کرنے لگا کہ غلام سے قصور ہوا"

وہ گڑگڑا رہا تھا اور جس سے معذرت کی جا رہی تھی، اس کی زبان پر بقول حاجی صاحب مرحوم یہ
الفاظ جاری تھے کہ

"کچھ مضائقہ نہیں، غریب لوگوں کو محنت و مزدوری سے کب چھٹکارا ہوتا ہے اور میں تو
تمہارے گھر کا آدمی ہوں جو کچھ حاضر ہے دہی لے آؤ"

غریب اللہ دیا کو دعوت اگر یاد بھی رہتی تو زیادہ سے زیادہ گیہوں کی روٹی پیش کرنے کی ہمت کر سکتا
تھا، ماحضر اس کے گھر کا اس دن، ماش ہی کے آٹے کی روٹی اور ماش ہی کی صرف کالی دال تھی،
حاجی صاحب کہتے تھے کہ

"ڈرتا ڈرتا، آپ کے سامنے دہی لے آیا"

اب آگے واقعہ کی روداد حاجی صاحب ہی کے الفاظ میں سنئے، کہتے تھے کہ

"آپ نے (سیدنا الامام الکبیر) نے اس کو (ماش کے آٹے کی روٹی اور ماش کی کالی دال کو) ایسی ہی رغبت سے تناول فرمایا جیسے کوئی پلاؤ قورمہ کو کھاتا ہے"

بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، آگے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ

"جب حضرت اپنی معمولی غذا کھا چکے، اور ہاتھ کھینچا تو اس نے نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ حضور آپ کے لائق تو نہیں، مگر کچھ اور بھی کھالیں، آپ نے اس کی دل داری کی وجہ سے اور چند لقمے تناول فرما کر ہاتھ کھینچا، اس سادہ لوح نے پھر عرض کیا کہ حضرت تھوڑا اور کھالیں، آپ نے باوجود سیری، چند لقمے اور تناول فرمائے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس دعوت شیراز کی یعنی ماش کی۔

"دال اور روٹی کی تعریف فرما کر اسی کیفیت سے واپس تشریف لائے" (سوانح مخطوطہ صہ ۲۶)

شاید اپنی دعوت کی تعریف ہی سے میاں اللہ دیا کی جرات بڑھتی چلی گئی، اور لطیف و نفیس غذاؤں کے متعلق جس کا حال یہ تھا جیسا کہ مولانا منصور علی خاں مرحوم حیدرآبادی لکھا ہے کہ

"خوراک ان کی (سیدنا الامام الکبیر) کی نہایت قلیل تھی، کبھی غذا کو حرص و رغبت کے ساتھ نہیں کھایا۔ چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے" صہ ۱۹۱

جیسا کہ چاہئے تھا اللہ دیا کے اس اصرار بے جا کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس

"غذا ثقیل بلکہ اثقل سے آپ کو بہت تکلیف پیش آئی، تین دن تک کھانا نہ کھایا"

مگر اللہ دیا تو اللہ دیا حاجی یٰسین صاحب کہتے تھے کہ اپنی اس تکلیف کا حال حضرت نے

"کسی پر ظاہر نہ کیا" صہ

کہ غریب کا دل نہ دکھے، اسی لئے خود جو دکھ اٹھانے پر خوشی تیار ہو جاتا ہو، اسی کے متعلق مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی نے جو اپنی آپ بیتی یہ سنائی ہے، یعنی جن دنوں وہ نانوتہ میں پڑھنے کی غرض سے حضرت والا کی خدمت میں حاضر تھے، اسی زمانہ کا ایک قصہ جان ہی کے ساتھ

منگوا کر تقسیم فرماتے" ص۲۰۲

اور گو بقول مولٰنا حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی کہ اس مجلس مبارک میں تقسیم ہونے والی چیزوں میں خواہ میوہ ہو، یا شیرینی سب ہی کے متعلق حضرت والا کا دستور تھا کہ

"بقدر نمک چشی کے اس میں سے لیا کرتے، باقی سب کو دے دیا کرتے" ص۱۹۲

لیکن باوجود اس کے "ہنسی اور مذاق" جس کی خبر حضرت تھانوی نے دی، اس کی نوعیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، امیر شاہ خاں مرحوم ہی اس قصہ کے راوی ہیں کہ ایک دن مٹھائی کی تقسیم کا کام مولوی فاضل صاحب نامی ایک صاحب کے سپرد ہوا، تقسیم کرنے کے بعد بھی کچھ مٹھائی بچ کر رہ گئی۔ سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک پر جاری ہوا کہ "الفاضل للقاسم" (بچی ہوئی مٹھائی قاسم کی ہونی چاہیے) مگر بے تکلفی کے اس ماحول کا اندازہ کیجئے کہ معاً سننے کے ساتھ مولوی فاضل صاحب بھی "الفاضل للفاضل والقاسم محروم[۱]" کے فقرے سے جواب دے کر اس بچی ہوئی مٹھائی پر اپنے حق کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے الفاظ کہ "مولانا محمد قاسم کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب ہوتا تھا" یہ اسی کی ایک مثال ہے، یہ مولوی فاضل صاحب حضرت والا کے خدام میں تھے، لیکن کسی کے کرم ہائے فراواں کی چھاؤں میں انبساط اور بے تکلفی کی ان حدود تک چڑھ کر پہونچ جاتے تھے۔ کسی موقعہ پر ذکر آچکا ہے کہ حماسہ و سبعہ معلقہ کے مشہور شارح، اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مولانا شبلی اور مولٰنا عبد اللہ ٹونکی وغیرہم حضرات کے استاذ محترم مولٰنا فیض الحسن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت والا کی مجلس انبساط و انشراح میں رونق افروز ہو جاتے تو جانبین سے لطائف و ظرائف کا تبادلہ ہوتا، اور خوب ہوتا، ایک طرف مولانا فیض الحسن فرماتے کہ

"اے جا گنوار کے لونڈے تجھے ان چیزوں (علوم) سے کیا واسطہ تو جا کر ہل جوت، کھیتی کر"

---

[۱] الفاضل للفاضل کا مطلب ہے کہ بچی ہوئی مٹھائی فاضل کی ہوئی۔ یہ لفظی تناسب سے فائدہ اٹھایا گیا باقی دوسرا فقرہ القاسم محروم یہ عربی زبان کا ایک عام محاورہ ہے کہ عموماً بانٹنے والا بے چارہ ہی حصہ سے محروم رہ جاتا ہے۔

مولانا فیض الحسن کا رنگ سانولا بھی تھا اور طول وعرض میں بھی جسم کو ترقی کا کافی موقعہ قدرت کی طرف سے ملا تھا، رنگ اور ڈیل ڈول کی ان ہی خصوصیتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ان کو یہ جواب ملتا کہ

"خیر ایک بھینسا تو موجود ہے"

اور یہ تو گویا غنیمت ہے، ایک اور لطیفہ کا ذکر اس موقعہ پر لوگ کیا کرتے ہیں، اگر وہ صحیح ہے، تو اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شاید مولٰنا فیض الحسن کی ظرافت گدگدی پیدا کرکے تھوڑی دیر کے لئے حضرت والا کو بھی اتنا بے چین کر دیتی تھی کہ شاید روک نہیں سکتے تھے، میرا اشارہ ٹوٹی ہوئی ٹونٹیوں کے لوٹے کے لطیفے کی طرف ہے، کہتے ہیں کہ چھتہ کی مسجد میں مولٰنا فیض الحسن بھی اترے ہوئے تھے، استنجا کے لئے لوٹا تلاش کرنے لگے، جو لوٹا بھی ملتا اس کی ٹونٹی اتفاق سے دیکھتے کہ ٹوٹی ہوئی ہے، مزاج میں ان کے شاعری تو تھی ہی، جھنجھلا کر بولے کہ یہاں تو جو لوٹا بھی ہے سب مختون ہی مختون ہے، کچھ اس انداز سے مولٰنا نے فرمایا کہ سیدنا الامام الکبیر سے نہ رہا گیا اور بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا کہ

"پھر آپ کو تو بڑا استنجا نہیں کرنا ہے"[1]

اور مولٰنا فیض الحسن صاحب تو خیر آپ کے ہم عمر، ہم نوالہ و ہم پیالہ بورگ تھے، مرید بھی دونوں ایک ہی شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، میں تو دیکھتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی دلداریاں سیدنا الامام الکبیر کی مجلس قدس میں جن شکلوں کے ساتھ کی جاتی تھیں اپنے وقار وعظمت کے محافظوں کے لئے تو شاید ان کا سننا بھی دشوار ہو۔ مولٰنا منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم بیان کیا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر۔

---

[1] حضرت تھانوی نے اس روایت پر اپنی طرف سے ایک نوٹ کا اضافہ فرمایا ہے کہ عام طور پر ادباب ظرافت کا ذہن اس فقرے سے جس چیز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اس کے سوا ایک سنجیدہ مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہو کہ بڑی ٹونٹی کے لوٹے سے پانی منظم شکل میں نہیں نکلتا اور بڑے استنجا کے لئے شاید ناکافی ہو ۱۲

"بچوں سے بہت خوش طبعی کیا کرتے تھے"

مگر اس خوش طبعی میں بھی، ظرافت کے ساتھ ساتھ سمجھ بوجھ کی باتیں بھی شریک ہوتی تھیں،

حکیم صاحب ہی نے ایک لطیفہ کا ذکر کیا ہے کہ

"ایک بچے کو فرمایا کہ اس بیل کی دم سے اس کو باندھ دو"

لکھا ہے کہ "بچہ بگڑ گیا اور جھلا کر بولا کہ میں نہیں جاتا" تب بچے کی فہمائش ہونے لگی کہ

"بوجھ دونوں طرف برابر ہو جائے گا"

پھر بچے کو سمجھایا جاتا کہ دیکھ! بیل کے

"آگے سر اور گردن ہے، پیچھے تو لٹک جا" ص ۱۹۲

یوں دونوں طرف کا وزن برابر ہو جائے گا،

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی یہ لکھ کر کہ "بچوں سے چھیڑ بھی فرماتے" یہ اطلاع دی ہے کہ

"خصوصاً مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب کی ساری اولاد سے" ص ۲۵

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصنف امام کے بچوں کو شفقت و کرم عنایت و نوازش کا حصہ زیادہ عطا فرمایا جاتا تھا، مولانا محمد یعقوب صاحب کے بچوں میں ایک صاحبزادے جن کا نام جلال الدین تھا، امیر شاہ خاں صاحب اُن کا نام خصوصیت کے ساتھ لے کر یہ روایت بیان کیا کرتے تھے کہ

"جلال الدین صاحبزادہ مولانا محمد یعقوب کے جو اس وقت بالکل بچے تھے بڑی ہنسی کیا کرتے تھے، کبھی ٹوپی اتارتے، کبھی کمر بند کھول دیتے تھے" ص ۲۰۳

اور حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے قصص الاکابر میں جو یہ لطیفہ درج ہے کہ ایک بچہ بڑے پیٹ والا سامنے سے (سیدنا الامام الکبیر) کے گذرا تو مسکرا کر فرمایا

"چُلا بھالا، گرد بڑ جھالا"

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"یہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا ٹکڑا ہے"

وہی یہ بھی فرماتے تھے کہ

"مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک لڑکا بڑے پیٹ کا تھا اس کے بارے میں (یہ شعر) فرمایا تھا" قصص الہادی ماہ جمادی الاول ۷۵ھ

واللہ اعلم بالصواب یہ وہی جلال الدین نامی مولانا کے صاحبزادے تھے، یا مولانا کے کسی دوسرے بچے کو یہ افتخار بخشا گیا تھا کہ خاص کر شعر ہی موزوں فرما دیا گیا تھا، اور جب وہ بچہ سامنے آتا تو زبان مبارک پر وہی شعر یا اس کا کوئی ٹکڑا جاری ہو جاتا، اور یہ بچے تو خیر برادری کے بچے اور شیخ زادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ماسوا اس کے معصوم بچے تھے، مگر حضرت حکیم الامت تھانوی کی طرف قصص میں یہ روایت جو منسوب کی گئی، کہ دار العلوم دیوبند کی طالب العلمی کے دنوں میں آموں کی دعوت طلبہ کی ہوئی اس دعوت میں مولانا تھانوی خود بھی شریک تھے فرماتے تھے کہ طلبہ باہم ایک دوسرے پر رس نچوڑنے لگے اور گٹھلیوں چھلکوں سے ایک دوسرے لے حملہ شروع کر دیا عام اساتذہ تو ہٹ گئے، لیکن مولانا محمد قاسم صاحب طالب العلموں کے ساتھ تماشا دیکھتے رہے۔ الہادی ماہ رجب ۷۵ھ

ارواح ثلثہ میں روایت پائی جاتی ہے لکھا ہے کہ ایک پہلوان کشتی گیر، جس کا نام نبو تھا،

"دیوبند کا رہنے والا تھا"

اس شخص کے نام اور کام دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عامی آدمی تھا لیکن سنئے، بیان کیا گیا ہے کہ دیوبند کے اسی مقامی پہلوان نبو نے

"باہر کے کسی پہلوان کو پچھاڑ دیا"

اس کی خبر سے دیوبند کے باشندوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور دوسروں کے ساتھ صرف یہی نہیں کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی خوشی ہوئی"

بلکہ راوی کا بیان ہے کہ فرط مسرت سے سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا کہ

"ہم بھی ننھو کو اور اس کے کرتب کو دیکھیں گے"

اور بات خیال ہی کی حد تک محدود نہ رہی بلکہ

"حافظ انوار الحق کی بیٹھک میں اسے (ننھو پہلوان) کو بلایا گیا"

اس بیٹھک کے سامنے کوئی میدان تھا جس سے اکھاڑہ کا کام لیا گیا، اور ننھو پہلوان نے اسی میدان میں کشتی گیری کے کمالات کا مظاہرہ شروع کیا، اور جس کا خیال بھی اس زمانے کے علمی غرور کیلئے ناقابل برداشت تھا، اسی غریب ننھو پہلوان کے

سب کرتب (سیدنا الامام الکبیر نے) دیکھے" ص۲۰۲

اور سچ تو یہ ہے کہ حال جس کا بقول صاحب سوانح مخطوطہ یہ ہو کہ

"دہلی میں مولانا (محمد قاسم) کا ایک ادنیٰ عامی شخص مہمان ہوا،

اور بپاس ادب اپنی حقہ نوشی کا اظہار نہ کیا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس غریب کو ریاح کا عارضہ تھا، اور حقہ پینے سے فائدہ ہوتا تھا، رات کو حقہ پیئے بغیر جو وہ سو رہا تو لکھا ہے کہ

"پچھلی رات کو اس کو نفخ ہوا، اور سخت تکلیف پیش آئی"

واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، کہ اس غریب حقہ باز کی بےچینیوں کو مولانا نے بھانپ لیا، اور بغیر کسی ہنگامہ کے، راوی نے بیان کیا ہے کہ

"اسی وقت دبے دبے پاؤں جاکر مولانا (محمد قاسم) نے خود چلم بھری اور حقہ اٹھا کر اس کے (اس غریب آدمی) سامنے لائے"

ہاتھ میں حقہ تھا اور سنا جا رہا تھا، معذرت پیش کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر اسی حقہ پینے والے سے فرما رہے تھے کہ

"آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں" ص۲۵

اسی کے ساتھ ہمیں مصنف امام کی اس اطلاع کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

"بالکل آزاد تھے، رندانہ وضع تھی چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے ڈاڑھی چڑھاتے تھے،

اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ

"نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے"

مگر مطبع کی ملازمت میں خواجہ تاشی کا رشتہ سیدنا الامام الکبیر سے قائم ہوا اور روز بروز ترقی کرتے ہوئے یہی ربط اس درجہ تک پہونچ گیا کہ بقول امیر شاہ خاں صاحب

مولٰنا نانوتوی سے اور ان سے (حافظ جی سے) نہایت گہری دوستی تھی"

اسی "گہری دوستی" کے مظاہر یہ تھے کہ

"وہ (حافظ جی) مولانا محمد قاسم کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے اور مولٰنا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے، مولٰنا ان کو کنگھا کرتے اور وہ مولٰنا کے کنگھا کرتے"۔

خاں صاحب ہی کا بیان ہے کہ ان حافظ جی کا خیال سیدنا الامام الکبیر اس حد تک فرمایا کرتے تھے کہ

"کبھی مٹھائی وغیرہ اگر مولٰنا کے پاس آتی تو ان (حافظ جی) کا حصہ ضرور رکھتے تھے"

خاں صاحب مرحوم یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

"مولٰنا کے مقدس دوست، مولٰنا کی ایک آزاد شخص کے ساتھ اس قسم کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ (سیدنا الامام الکبیر) اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے" ص ۱۲۴

واللہ اعلم مقدس دوست سے مراد خاں صاحب کی کیا ہے، تاہم اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسروں میں مولٰنا کے اس طرز عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی، لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ سچ ہے جیسا کہ خاں صاحب نے آگے بیان کیا ہے کہ بالآخر یہ آزاد حافظ جی کی آزادی زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکی، ایک دن جب وہ اور مولٰنا تنہا تھے، کہا جاتا ہے کہ مولٰنا نے حافظ جی سے کہا کہ بھئی! ہماری دوستی کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ دونوں کا رنگ ایک ہی ہو، اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری وضع قطع کچھ اور ہو، اور تمہارے دوست کی کچھ اور، فرمایا کہ لاؤ میں ہی تمہارا رنگ اختیار کرتا ہوں، خانصاحب کی روایت ہے کہ حافظ جی بے چاروں کی

آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، اور اسی کے بعد پھر اپنے درست کا ایسا پختہ رنگ اختیار کیا کہ پرہیزگار مسلمانوں کی وضع قطع بھی اختیار کر لی،

"اور اس روز سے پکے نمازی، اور نیک وضع بن گئے" ص۱۷۱

ایسا اگر ہوا، تو نفسیات انسانی کا جو عام قانون ہے اس کا یہی مقتضا بھی تھا، آپ ناپاکوں کی تحقیر و توہین کرکے یقین مانئے ناپاکی کے ازالہ میں اتنا کامیاب نہیں ہو سکتے، حقیقی کامیابی اس تدبیر سے ہو سکتی ہے جس کا عملی نمونہ سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

لیکن یہ خیال کہ حضرت والا کے اس طرز عمل میں ابتداہی سے یہ اصلاحی غرض پوشیدہ تھی، یعنی حافظ جی کو راہ راست پر لانے کے لئے قصداً و ارادۃً ان کے ساتھ آپنے میل جول بڑھایا تھا، شاید یہ نکتہ بعد الوقوع ہی کی حیثیت رکھتا ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آپکے فطری نہاد کا یہ اقتضا تھا اپنی مقدس پاکی کا خطرہ ہی جس کے قلب پر نہ گذرتا ہو وہ اپنے دامن کو بچانے کی فکر میں کیوں مبتلا ہوگا، آخر حافظ جی مرحوم کا یہ کوئی انفرادی واقعہ ہے، جو کچھ آپ اب تک سن چکے ان کی یاد کو بھی تازہ کیجئے۔ اور اسی کے ساتھ ملائیے، اس قسم کی روایتوں کو مثلاً وہی مولوی عبدالسمیع مرحوم کا واقعہ جن سے مسئلہ میلاد" کے متعلق علماء دیوبند سے تحریری مناظروں کا بھی سلسلہ جاری تھا، اور غالباً تقریری مباحثے بھی ہو جاتے تھے۔ "براہین قاطعہ" وغیرہ اس سلسلہ کی مشہور کتابیں ہیں مگر حضرت حکیم الامت تھانوی کی روایت ہے، فرماتے تھے

"ایک صاحب نے میرٹھ میں مولٰنا سے دریافت کیا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب تو مولود شریف کرتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں کرتے"؟

علماء دیوبند کی طرف سے اسی سوال کے جواب میں ہزار ہا ہزار صفحات جس زمانہ میں شائع ہورہے تھے، عین ان ہی دنوں میں جماعت کے امام کبیر کی زبان مبارک سے یہ جواب بھی سنا گیا تھا کہ

"بھائی! انہیں (مولوی عبدالسمیع صاحب) کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ

"محبت معلوم ہوتی ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ محبت نصیب کرے" ۲۱ قصص الہادی جمادی الاولیٰ ۵۷ھ

حضرت تھانوی یہ بھی فرماتے تھے، یہ جواب جب مولوی عبد السمیع کے کانوں تک کسی طرح پہنچگیا، خود حکیم الامت سے کہنے لگے کہ

"ایسے سے بھلا کوئی کیا لڑے"

وہی واقعہ جس کا ذکر ارواح ثلاثہ میں بھی کیا گیا ہے، اور قصص الاکابر میں بھی حضرت تھانوی کی زبانی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک صاحب جو طبقہ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے۔ علماء دیوبند نے جن امور کے بدعت ہونے کا فتویٰ دے رکھا تھا' ان میں وہ مبتلا تھے، لیکن سیدنا الامام الکبیر کی تعریف سن کر خدمت والا میں حاضر ہوئے، حضرت تھانوی کی روایت میں ہے کہ

"مولانا (محمد قاسم) نے نہایت عزت کے ساتھ ان کو مہمان بنایا"

اور بات اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی کے ساتھ جیسا کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"سب طالب العلموں کو سمجھا دیا کہ خبردار کوئی گفتگو ان کے طریقہ کے خلاف نہ کیجائے کیونکہ مہمان کی دل شکنی نہ کرنی چاہئے"[1]

اسی موقعہ پر وہ صورت پیش آئی کہ حضرت گنگوہی تک آپ کے اس طرز عمل کی اطلاع پہونچائی گئی اور وہاں کی یہ تنقید کہ بدعتی کا اکرام کیوں جائز ہے، سیدنا الامام الکبیر کے سامنے نقل کرنیوالوں نے صرف نقل ہی نہیں کیا، بلکہ تنقید کا جو جواب دیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو کافر مہمانوں کا بھی اکرام کرتے تھے، حضرت گنگوہی کو لوگوں نے جا کر سنایا۔ سن کر فرمایا کہ کافر کے اکرام میں

---

[1] حکیم الامت ہی کے حوالہ سے قصص الاکابر میں غالباً مزید اضافہ کے ساتھ یہی روایت دوسری جگہ بھی ملتی ہے، جس میں ہے کہ یہ صاحب ٹھسکہ کے رہنے والے تھے، حکیم الامت نے یہ بھی فرمایا کہ بدعات میں مبتلا ہونے کے باوجود خوبی ان میں یہ تھی کہ دکاندار نہ تھے یعنی دین فروخت کر کے دنیا کے خریدنے والے مشائخ میں نہ تھے، اسی میں ہے کہ حضرت نانوتوی نے رسم مشائخ کی پیروی کرتے ہوئے شاہ صاحب کی خدمت میں نذر بھی پیش کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاہ صاحب کی خاطر مدارات اپنے تلامذہ کے سپرد کر کے شاہ صاحب کے ساتھ جو بھنگی سائیس تھے ان کو خود کھانا کھلوایا' کہتے ہیں کہ چلتے ہوئے شاہ صاحب نے کہا کہ فقیر تو آپ ہیں ہم تو صرف نقال ہیں (قصص بحوالہ الہادی جمادی الثانی ۵۱ھ)

غلط فہمی اور فساد کا احتمال نہیں، برخلاف اس کے بدعتی کے اکرام میں اندیشہ ہے کہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو یعنی سمجھنے لگے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اسکی تصحیح کی گئی، اور دوسرے بھی چاہیں تو یہی غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہتے ہیں کہ جب حضرت نانوتوی کے سامنے حضرت گنگوہی کا یہ قول نقل کیا گیا، تو جو صاحب اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر پہونچا رہے تھے ان کو جیسا کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے؛

"مولانا (محمد قاسم) نے اس کو ڈانٹ دیا کہ یہ کیا واہیات ہے، اِدھر کی اُدھر لگاتے پھرتے ہو، بیٹھو اپنا کام کرو" (قصص) بحوالہ الہادی ماہ جمادی الاول ۵۷ھ

حالانکہ چاہتے، تو اس کا جواب بھی دے سکتے تھے، لیکن خیال میں اختلاف رکھنے والوں کے احترام میں بھی کسی کوتاہی کو جس کا بے نفس دل برداشت نہیں کر سکتا تھا کیا اس میں حضرت گنگوہی جیسے ہم مشرب ہم عقیدہ ہم خیال ہم استاذ وہم رفیق الدنیا والآخرۃ کے مقابلہ کا خطرہ بھی گذر سکتا تھا، لوگ فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے کہہ رہے ہیں، میرا تو دماغ چکرا جاتا ہے، جب امیر شاہ خاں مرحوم کی وہ بات یاد آتی ہے، جو مولٰنا فضل رسول بدادنی کے سلسلے میں وہی بیان کیا کرتے تھے، موجودہ نسلیں شاید مولوی صاحب کی خصوصیتوں سے ناواقف ہو چکی ہیں، بس اتنی بات سمجھ لیجئے، کہ آج دیوبندی علماء کہئے، یا ولی اللہی خانوادہ کے اہل علم کے نام سے ان کو موسوم کیجئے. اس طبقہ کے مقابلہ میں "بریلویوں" کی جو جماعت آستینیں چڑھا کر تقریباً ایک صدی سے کھڑی ہوئی ہے اور گفتنی ناگفتنی، کردنی ناکردنی الغرض جو کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا، ان سارے حرکات کا ارتکاب مسلسل کرتی چلی آرہی ہے، یہ سارا قصہ درحقیقت بداؤن کے ان ہی مولوی فضل رسول صاحب پر منتہی ہوتا ہے، پہلی آستین ان ہی کی تھی، جو ولی اللہی تجدیدات واصلاحات کے مقابلہ میں چڑھائی گئی۔

ولی اللہی خانوادے کے نیازمندوں میں مولوی فضل رسول صاحب کی جانب سے ایسی صورت

میں جس قسم کی گرانیاں پیدا ہوسکتی تھیں، قدرتاً وہ پیدا ہوگئی تھیں" امیر شاہ صاحب مرحوم اسی میدان کے ایک مرد خاص تھے، کہتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر خورجہ تشریف فرما تھے کسی مجلس میں مولوی فضل رسول صاحب بدایونی کا ذکر چھڑ گیا" آگے امیر شاہ مرحوم ہی کی زبان سے سنئے، ارواح ثلاثہ میں بھی یہ روایت ان کے حوالہ سے درج ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ

"میری زبان (یعنی امیر شاہ خاں کی زبان) سے بجائے فضل رسول (بضاد معجمہ)
فصل رسول (بصاد مہملہ) نکل گیا"

گویا ایک نقطہ کو فضل کے لفظ سے ساقط کر کے امیر شاہ خاں صاحب مولوی صاحب کو ایک ایسی ہستی قرار دے رہے تھے۔ جو رسول کی امت کو رسول کی راہ اور سنت سے جدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے، ظاہر ہے کہ تقریباً یہ وہی خیال تھا جو دیوبند کی جماعت مولوی صاحب کے متعلق رکھتی تھی، ان پر الزام ہی یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی جگہ بدعت کی ترویج سے دل چسپی رکھتے ہیں" شاید خان صاحب سمجھے ہوئے تھے، کہ ایک نقطہ کے ردوبدل سے جو نکتہ میں نے پیدا کیا ہے، وہ سیدنا الامام الکبیر کی خوشنودی کا باعث ہوگا لیکن بالکل خلاف توقع وہ سن رہے تھے کہ حضرت والا ان سے پوچھ رہے ہیں کہ

"لوگ ان کو (مولوی فضل رسول کو) کیا کہتے ہیں"

خاں صاحب نے عرض کیا کہ "فضل رسول کہتے ہیں" تب آپ نے فرمایا اور خان صاحب ہی کے الفاظ ہیں کہ ناخوش ہو کر فرمایا کہ

"تم فصل رسول کیوں کہتے ہو"

حوصلہ کی وسعت، نظر کی بلندی کی یہی وہ مثالیں ہیں، جن سے ہم سیدنا الامام الکبیر کے باطنی نفسیات کی خصوصیتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں، مخالف سے مخالف شخصیتوں کی ہلکی سی ہلکی تحقیر خواہ کنایوں اور اشاروں ہی میں کیوں نہ ہو آپ کے لئے ناقابل تحمل بن جاتی تھی اور امیر شاہ خاں

صاحب جیسی محبوب ہستی کے ساتھ بھی اس معاملہ میں کسی قسم کی رواداری پر تیار نہ تھے۔ بھری مجلس میں وہ ٹوک دیئے گئے، اور ہمیشہ کے لئے ان کو سبق مل گیا!

نظائر و امثال کو میں کہاں تک نقل کروں، وہی واقعہ کیا معمولی واقعہ ہے، جس کے راوی بھی یہی امیر شاہ خاں ہیں۔

میرٹھ میں حضرت والا کا قیام تھا، سارے شہر کے مرجع اور منظور نظر بنے ہوئے تھے امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ ایک مکان تھا، جس کے بالاخانہ پر حضرت مولٰنا محمد یعقوب ٹھہرے ہوئے تھے اور نچلی منزل حضرت والا کی فرودگاہ تھی، اسی مکان میں خاں صاحب کی روایت ہے کہ

"ایک رنڈی اپنی چھوکری کو جوسیانی تھی اپنے ہمراہ لائی"۔

اور ہمراہ لاکر اس نے کیا کیا؟ خاں صاحب کے الفاظ ہیں کہ

"اور مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ میری چھوکری ہے، مدت سے بیمار چلی جارہی ہے، میری اوقات بسر اسی پر ہے، آپ اسے تعویذ دیدیجئے یا دعا کر دیجئے"۔

پھر آگے کیا ہوا؟ چاہیے تو یہی تھا اور شاید لوگوں کو یہی سننے کی توقع بھی ہو گی کہ جھڑک کر وہ نکال دی گئی ہوگی، کم از کم اپنی علمی پوزیشن کی حفاظت ہی کے لئے سہی موقعہ اسی کا تھا کہ دھتکار کر باہر نکل جانے کا حکم اس کو دیا جاتا،

مگر امیر شاہ خاں مرحوم کی یہ اطلاع ہے کہ بجائے کچھ کہنے سننے کے (شاید ظرافۃً) صرف یہ کیا، کہ بالاخانہ جس پر مولٰنا محمد یعقوب ٹھہرے ہوئے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ادہر ایک بزرگ ہیں تم ان کے پاس جاؤ"

حسب الحکم وہ زینوں پر چڑھتے ہوئے اچانک مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی، اور اپنا معروضہ پیش کیا۔ لکھا ہے کہ بگڑتے ہوئے مولانا محمد یعقوب صاحب نیچے اتر آئے اور دریافت فرمانے لگے کہ اس عورت کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا، حضرت والا دم سادھے خاموش بیٹھے رہے، مولٰنا محمد یعقوب بھیجنے والے کو سخت وسست فرمارہے تھے اور مزے

لے کر حضرت سن رہے تھے۔[1]

یہ، اور اس کے سوا کے بعد دیگرے شواہد و بینات کا طویل سلسلہ آپ کے سامنے جو پیش ہو چکا ہے، ان پھلوں کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے میں شاید زیادہ دشواری باقی نہ رہی ہو گی!

تاہم اس موقعہ پر یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الامت کے لقب سے رفیع ذکر کی سرفرازی جس ذات گرامی کو چودھویں صدی ہجری میں قدرت کی طرف سے حاصل ہوئی تھی، ان ہی کے کلمات طیبات میں اس سوال کا جو جواب ملتا ہے، سوچنے والوں کے لئے اسے ایک جگہ جمع کر کے رکھدوں۔

قصص الاکابر میں ایک موقعہ پر اس کی تصریح فرماتے ہوئے کہ

مجھے مولانا گنگوہی کے ساتھ زیادہ عقیدت ہے[2]، بہ نسبت مولانا محمد قاسم کے اور بعض

---

[1] قصہ کا تکملہ یہ ہے کہ عورت بیمار لڑکی کے ساتھ واپس چلی گئی، اور کچھ دن بعد پھر واپس ہوئی، عرض کرنے لگی کہ آپ لوگوں کی توجہ سے لڑکی میری اچھی ہوگئی، کہتے ہیں کہ اپنے ساتھ کچھ مٹھائی بھی بطور شکرانے کے لائی تھی، دیکھ کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ حرام کی کمائی ہے، اسکا کھانا حرام ہے، صرف مسکینوں پر بطور خیرات کے تقسیم ہو سکتی ہے۔

[2] ایک موقعہ پر آپ ہی کی طرف قصص الاکابر میں یہ بیان بھی منسوب کیا گیا ہے کہ ذکر مولود شریف کی مجلس کا ہو رہا تھا مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے کسی نے مولود کے متعلق دریافت کیا، تو فرمایا کہ بھائی دا تنا برا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں اور نہ اتنا اچھا ہے جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے اس قول کو نقل کر کے حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اس قدر جامع جواب ہے کہ ایک سال کا رسالہ اسکی شرح میں لکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ گول جواب ہے، عوام نہیں سمجھ سکتے، ہر فریق اپنی تائید میں اسکو پیش کر سکتا ہے۔ پھر آگے یہ بھی مولانا تھانوی نے اضافہ فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کھلم کھلا کسی کو برا نہیں کہتے تھے، ایسے سوالات کے بہت نرم جواب دیتے تھے، پھر حضرت گنگوہی کی خصوصیت بیان کی کہ وہ بالکل صاف صاف کہتے تھے ایک ہی دفعہ میں چلے، ٹھیرو، یا جاؤ، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، حضرت تھانوی نے اس کے بعد اپنے تغیر مذاق کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ پہلے میں بھی نرم جوابات کو پسند کرتا تھا، لیکن اب تجربہ کے بعد مولانا گنگوہی کا طرز نافع ثابت ہوا، نرم جواب میں یہ مصلحت سمجھی جاتی ہے کہ مخاطب کو وقت نہ ہو، اور وہ ہم میں آجائے حالانکہ یہ غلط ہے وہ ہم میں نہیں آتے وہ تو اپنے ہی خیال کی بناء پر ہم میں آتے ہیں تو یہ در اصل آنا نہ ہوا، ہاں ہم ہی ادھر چلے گئے، وہ ہم میں نہیں رہے، بحوالہ حسن العزیز صفحہ ۱۷۱ ملفوظ ۲۸۱ ج اول۔ ظاہر ہے کہ حکیم الامت کی بات حکیم الامت ہی کی بات ہے، لیکن ایسے مسائل جن کے متعلق شریعت کے محکم و منصوص احکام موجود ہوں ان کے متعلق تو دو ٹوک الفاظ میں جواب دینا شریعت کیساتھ غداری ہے لیکن جن مسائل کے متعلق قطعی فیصلہ آسان نہ ہو ان میں ترجیحی رائے تو دی جا سکتی ہو لیکن حتم و جزم کے الفاظ میں جواب اگر نہ دیا جائے تو شاید احتیاط کا پہلو بھی ہو سکتا ہے اور غالباً سیدنا الامام الکبیر پر اسی روش کا غلبہ تھا ۱۲

لوگ اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں"۔

پھر مولانا گنگوہی کی خصوصیتوں کو نقل فرماتے ہوئے اپنا احساس سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ ظاہر فرمایا ہے کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب میں شان ولایت کا رنگ غالب تھا، اور مولانا گنگوہی میں شان نبوت کا" (ص ۱۲۷ ہادی ماہ جمادی الثانی ۵۷ھ)

ظاہر ہے کہ "شان ولایت" خود ایک مجمل بات ہوئی، غالباً اسی لئے اس کی تشریح ایک موقع پر ان الفاظ فرمائی گئی ہے، کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب مغلوب الحال و مغلوب الاخلاق تھے، اپنے شاگردوں کو مخدوم و مکرم لکھتے تھے"[1]

[1] ہو سکتا ہے کہ اشخاص کے ساتھ حضرت والا کے اس ملاطفت آمیز طرز عمل کی وجہ تربیت ہو، ظاہر ہے کہ تربیت اور تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے تعلیم سب کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن تربیت میں اشخاص کے مزاج اور طبیعت کی رعایت سے تدبیر کی جاتی ہے تعلیم کا مقصد علم پہنچا دینا ہے اور تربیت کا مقصد پہونچائے ہوئے علم پر عمل کرانا ہے جیسے تعلیم طب کا حاصل تو فن کے اصول و مسائل مستفید کے ذہن میں ڈالدینا ہے اور طب کا حاصل ان اصول و مسائل کے تحت علاج کرنا ہے سو اس میں ہر مریض کے مزاج کی رعایت علیحدہ علیحدہ لازمی ہوتی ہے ایک ہی مرض کے چند مریضوں کے نسخے الگ الگ ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج الگ الگ ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ سے ایک دیہاتی بیعت ہوا جسے افیون کی عادت تھی حضرت نے فرمایا کہ روزانہ کی مقدار سے آدھی مقدار کھالیا کر اور پھر چند دن کے بعد اس آدھی میں سے آدھی کر دینا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی رو سے تو افیون کی پوری اور آدھی سب ہی مقداریں حرام تھیں لیکن یہ تعلیم نہ تھی تربیت تھی جس میں چند دن ایک فعل حرام کا تحمل کیا گیا تاکہ آئندہ ہمیشہ کے لئے عادۃً بدرفتہ رفتہ چھوٹ جائے، اگر ابتداہی میں یکدم اسے روکدیا جاتا تو یا بیمار پڑجاتا یا اکتا کر اس تعلیم سے بیزار ہو جاتا اور ہمیشہ افیونی رہتا، اسی طرح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بہت سے مریضان نفوس سے اولاً موانستہ کے ذریعہ ان کے قلوب میں قبول کی استعداد پیدا فرماتے تھے اور جب وہ اک حد تک پیدا ہو جاتی تو آخر میں انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیتے چنانچہ جہاں جہاں بھی حضرت والا کی یہ مسامحت واقع ہوئی ہے وہیں آخری نتیجہ مستفید کی اصلاح نکلی ہے۔ اندریں صورت مغلوبیت حال یا مغلوبیت اخلاق پر ان واقعات کو محمول کرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ انھیں حکمت تربیت کے ماتحت سمجھنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو مغلوب الحال کسی حال بھی نہیں ہوتے لیکن شخصی تربیتوں میں ان کے طریق عمل میں بھی اس قسم کی مسامحتوں اور ملاطفتوں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کفار قریش حاضر

(بقیہ صفحہ آئندہ)

روگ نکالو، مولانا عبدالعلی کے الفاظ ہیں کہ حضرت نے حکم دیا کہ

"مجھے اس خلجان سے (جس میں مخلوق کی آمد ورفت کی وجہ سے) مبتلا ہو گیا ہوں چھڑاؤ"

اور فرمایا کہ

"میری عقیدت لوگوں کے دلوں سے نکالو۔"

عقیدت پیدا کرنے کی کوشش کے مقابلہ میں عقیدت کے نکالنے کی مہم پر اپنے شاگردوں کو آمادہ کرنا، اور اس قدغن کے ساتھ بجد ہو کر ان کو مجبور کرنا کہ عقیدت مندوں کا یہ گروہ واقعی ازالۂ عقیدت کی اس مہم میں مشغول ہو گیا، مولانا عبدالعلی کہتے تھے کہ ہم لوگوں نے یہ قاعدہ بنالیا تھا کہ جہاں اس قسم کا کوئی آدمی حضرت سے ملنے آتا، تو دروازے ہی پر روک کر ہم لوگ اس کو سمجھاتے کہ

ارے بھائی! تو کس دھوکے میں ہے، مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر تو) نرے مُلّاں ہیں، یہ کیا جانیں فقیری کس کو کہتے ہیں، اگر تم کو کسی فقیر کی تلاش ہے تو کسی اور بزرگ کی خدمت میں جاؤ، یہاں کیا لوگے" (ص۳۵ سوانح مخطوطہ)

حاجی محمد عابد صاحب مرحوم جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم ہوئے ہیں وہ بھی سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے سنے ہوئے، یہ الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

"اگر میں یہ جانتا کہ پڑھ لکھ کر یہ دقتیں پیش آئیں گی (یعنی لوگ میرا پیچھا کریں گے تو) میں نہ لکھتا، نہ پڑھتا، صرف سیدھی سادی، نماز روزے کے مسائل سیکھ لیتا" (سوانح مخطوطہ ص۳۵)

یہ اور اس کے سوا جو کچھ بھی اس وقت تک آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر پڑھنے والے سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کو عملی زندگی کے جن میدانوں میں سرگرم کار ودم واپسیں تک پایا گیا۔ ان میں آپ خود اترے تھے، یا اتارے گئے تھے ان دونوں میں سے بجز آخری شق کے پہلی شق کے تصور کی کسی قسم کی گنجائش باقی رہی ہے کم از کم میرا ذاتی خیال تو یہی ہے اور یہی محسوس ہوتا ہے کہ جس حد تک اپنے آپ کو چھپانے اور گم کرنے کی کوشش وہ کرتے تھے، اسی حد تک انکو نمایاں کرنیوالا، اور رفع ذکر کی نعمت سے سرفراز کرنیوالا انکو باہر نکالتا چلا جارہا تھا گویا قرآنی

میں کچھ اس طرح مبتلا ہوئے اور قصباتی زندگی کا رنگ ان پر کچھ اتنا غالب ہوا کہ دیکھنے والوں کے نزدیک معلوم ہوتا تھا کہ شاید کچھ زیادہ لکھے پڑھے نہیں ہیں، وضع قطع، طریقہ بود و ماند نشست و برخاست بول چال سب ہی میں ضلع سہارنپور کے قصباتی باشندوں کی خصوصیتیں ان میں نمایاں تھیں، لیکن جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا الامام الکبیر نے اول سے آخر تک اس زمانے میں بھی جب سارا ہندوستان آپ کے غیر معمولی کمالات کے چرچوں سے گونج رہا تھا، اور ؎

هر کجا بوئے خدا می آید — خلق بیں بے سر و پا می آید

کا منظر پیش ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی ہمیشہ اپنے والد مرحوم کے ساتھ احسان و اطاعت کے قرآنی حکم کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی کیا معنے، شاید کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سفر سے حضرت والا جب نانوتہ تشریف لاتے تو دستور تھا کہ گھر سے پہلے کچھ دیر کے لئے مسجد میں قیام فرماتے، واپسی سفر کی نفل ادا کرتے، ادھر برادری والوں اور قصبہ کے عام باشندوں کے کان میں آپ کی تشریف آوری کی خبر جس وقت پہنچتی سب بے تحاشا مسجد کی طرف دوڑ پڑتے کافی مجمع ہو جاتا، اسی عام بھیڑ میں دوسروں کے ساتھ ملے جلے آپ کے والد بھی کھڑے ہوتے جوں ہی حضرت والا کی نظر ان پر پڑتی تو راوی کے الفاظ ہیں:

"گھبرا کر لپک کے"

پھر جانے ہیں آگے جو تماشا دیکھا جاتا تھا، وہ کیا ہوتا تھا، راوی کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے والد بزرگوار کے

"قدموں پر گر جاتے"

اور اس کی بالکل پروا نہ کرتے اکہ کون دیکھ رہا ہے، یا دیکھنے والے مجھے کیا سمجھتے ہیں، اور اس کا اقتضاء کیا ہے، کہتے ہیں کہ پھر والد کے قدموں سے سر اٹھاتے، اور

"ان کے ہاتھ کو چومتے"

اس موقعہ پر شیخ اسد علی صاحب اپنے بیٹے سے عموماً یہ فرماتے ہوئے کہ "بیٹا اچھے ہو" غالباً اپنی زندگی کی آخری تمنا پوری ہوتی ہوئی دیکھ کر

حضرت والا کی طرف سے والدین کی آخری سانس تک پیش ہوتے رہے ہیں، جو لوگ ان سے واقف ہیں ان کے قلوب میں اسکا خطرہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خاص حالات اور لاپروائیوں کو دیکھ کر یہی نتیجہ پیدا کر لیا گیا تھا کہ آپ نکاح نہیں کرنا چاہتے۔ والدین نے آپکے ذاتی رجحانات کی رعایت کرتے ہوئے زیادہ زور دینا خصوصاً جلال و جبروت کے ان دنوں میں مناسب خیال نہ کیا ہوگا، لیکن والدین آپ کے بہرحال والدین تھے، انسانی جذبات اپنے اندر رکھتے تھے اکلوتا بچہ اور وہ بھی ایسا اکلوتا کہ مسلسل چار پشتوں کی نمائندگی جس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو۔ اسکی عدم ازدواج کے اس رجحان پر کب تک صبر کر سکتے تھے؟ خصوصاً آپکے والد شیخ اسد علی مرحوم جو گھر گرہستی سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے انکے دل میں یہ تمنا مسلسل چٹکیاں لیتی رہتی تھی کہ اسی دلی سے پڑھ پڑھ کر نہ صرف گرد و نواح ہی میں بلکہ خود نانوتہ میں نوجوان آرہے ہیں اور ملازم ہو ہو کر اپنے گھر والوں کی فراغبالیوں میں اضافہ کر رہے ہیں، اسی نانوتہ میں مولوی محمد احسن نانوتوی، احیاء العلوم اور کنز الدقائق وغیرہ کتابوں کے مترجم بھی تھے، جنکا مکان حضرت والا کے مکان سے ملحق تھا، مولنا طاہر صاحب نے اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت اپنی یادداشت میں درج کی ہے کہ شیخ اسد علی مولنا مولوی احسن نانوتوی کے والد سے کہا کرتے کہ

"ایک تمہارا بیٹا ہے کہ مطبع نول کشور میں سو روپے (اس زمانہ میں) پا رہا ہے اور ایک ہمارا بیٹا ہے کہ باہر سے کما کر تو کیا لاتا اور الٹا گھر سے خرچ کر رہا ہے"

بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک میں جو قدرتی کشش تھی، اور نو عمری ہی سے قلوب آپکی طرف کھنچے چلے جاتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ باہر سے جب گھر نانوتہ تشریف لاتے اور اطراف و جوانب کے لوگوں کو اسکی خبر ہو جاتی مہمانوں کا تانتا بندھ جاتا سربراہی ان مہمانوں کی شیخ اسد علی صاحب مرحوم ہی کو کرنی پڑتی۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ جب

"وطن آتے، اور یہاں مہمان آتے، تو والدین کو دشواری ہوتی" ص۳۱

اور اس دشواری میں بھی سچ پوچھئے تو حضرت والا کے اس جرأت آزما ایمانی اقدام ہی کو بظاہر زیادہ

پریشانیاں جن کے وہ عادی نہ تھے، قدرتاً ان کے دل و دماغ میں ہلچل ڈالے رکھتی تھیں ان دشواریوں کے حل کی صورت کیا نکالی جائیگی لے دیکر نوجوان صاحبزادے کے ساتھ امیدیں وابستہ تھیں، لیکن حضرت والا کے رجحانات کو دیکھ کر مایوس ہو جاتے۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"حضرت کے والد کو...... ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا" صد ۳۲

آخر ان کے دل میں بھی وہی خیال آیا جو عموماً اس قسم کے مواقع میں آیا کرتا ہے۔ یہ خیال حضرت والا کے نکاح کا تھا مصنف امام نے آپ کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ

"والد (یعنی شیخ اسد علی صاحب) کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ ہی نوکری کرلیں گے" صد ۳۳

یہی پرانا طوق ہے جو والدین کی طرف سے آوارہ مزاج نوجوانوں کو فکر راہ پر لگانے کے لئے عموماً گلے میں ڈالا جاتا ہے، اور یہ ایک چلتا ہوا جادو ہے، شبابی اعصاب کا سارا کس بل عورت کے سوار ہو جانے کے بعد نکل جاتا ہے بیوی کی بشاشت کیلئے آدمی ہر اس بار کو اٹھانے کیلئے تیار ہو جاتا ہے، جس کا اس سے پہلے غریب شاید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اسی عام مشاہدے اور قاعدے کے زیر اثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چپکے چپکے اندر ہی اندر شیخ اسد علی صاحب نے مختلف خاندانوں میں آپ کی نسبت کے متعلق گفتگو شروع کی حسن اتفاق سے برادری کے ایک کافی فارغ البال صاحب ثروت خاندان والے رشتہ پر آمادہ ہو گئے۔ یہ قصبہ دیوبند کا وہی خانوادہ تھا، جو دیوان والوں کے نام سے مشہور ہے، مقدمہ میں تفصیل کے ساتھ اس خاندان کا ذکر کر چکا ہوں، بتا چکا ہوں کہ ان لوگوں سے برادری کے قدیم تعلقات شیخ اسد علی صاحب کے موروثی طور پر قائم چلے آرہے تھے، ایام طفلی میں سیدنا الامام الکبیر نے مکتبی تعلیم اسی گھر کے مکتب خانے میں پائی تھی۔ سب ہی کے جانے پہچانے تھے۔ بلندی کا جو ستارہ آپ کی پیشانی میں بچپن ہی سے چمک رہا تھا، شعوری یا غیر شعوری طور پر لوگ اس سے بھی متاثر تھے اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ آپ کے غیر معمولی ذہن و ذکاوت علم و فضل کے چرچے اس خاندان تک نہ پہنچے ہوں گے۔

بہرحال کچھ بھی ہو، مصنف امام نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ شیخ اسد علی صاحب نے حضرت والا کا

بہر حال پیرو مرشد کے ارشاد کی تعمیل پر تو آپ ضرور آمادہ۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک شرط بھی آپ کی طرف سے پیش ہوئی۔ بڑی دلچسپ شرط ! گویا جس پَر میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا، اسی پر کو آپ نے نوچ کر رکھدیا تھا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موروثی جائداد پر نظر ثانی کرنے کی وجہ سے شیخ اسد علی صاحب مرحوم جس زمانہ میں ہائے وائے کر رہے تھے تو ان کی ذات کی حد تک جیسا کہ "روایات طاہرہ میں ہے" حضرت والا اپنے والد ماجد سے فرماتے

"اگر آپ اپنی راحت و آرام کے خیال سے یہ فرماتے ہیں (یعنی نظر ثانی سے روکتے ہیں) تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی راحت و آرام کا مجھے ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کرتے کہ

"آپ کو کھانے پینے کی جس قدر چیزیں مرغوب ہیں۔ مجھ سے فرمادی جائیں، جب تک میں زندہ ہوں انشاء اللہ تعالیٰ ان میں قصور نہ ہوگا۔"

الغرض پدر بزرگوار کے مصارف کی حد تک تو احساس ذمہ داری میں آپ کا یہ حال تھا۔ لیکن شیخ اسد علی صاحب کے سامنے راحت و آرام سے اہم تو اپنے ہم چشموں کی اولاد کی کمائی کی کیفیت تھی، بقول مصنف جسے دیکھ دیکھ کر شیخ صاحب کہا کرتے تھے کہ سب

"پڑھ پڑھ کر نوکر ہوگئے، کوئی پچاس کا کوئی سو کا۔ کوئی کم، کوئی زیادہ، سب خوش و خرم ہیں اور ان کا اپنے بچہ کا، حال ویسا ہی"

(بقیہ صفحہ ۴۹۹)

آپ نے نکاح کرلیا تھا، اور ان کا انتقال جب ہوگیا تو یہی تھانہ بھون والی بی بی خیر النساء جن سے حاجی صاحب نے نکاح کرنے سے انکار کردیا تھا، بیوہ ہوکر حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لائیں اور لوگوں کی تحریک سے عقد ثانی ان کا حضرت حاجی صاحب سے ہوا، مولانا نانوتوی فرماتے تھے کہ مثنوی شریف کی یہ بی بی خیر النساء بڑی عالمہ تھیں، جب بی بی خیر النساء کی بصارت جاتی رہی تو ایک دوسری معمرہ مہاجرہ عورت سے جن کا نام امۃ اللہ تھا ان کی خواہش کے مطابق آپ نے نکاح فرمایا تھا۔ تاکہ خدمت کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ الغرض حاجی صاحب قبلہ کے گو تین نکاح ہوئے لیکن یہ سارے نکاح، ہجرت کے بعد حضرت نے کئے، لیکن جو زمانہ شادی کا ہوتا ہے، اس میں آپ مجرد ہی رہے۔ تحریک کی بھی گئی لیکن انکار فرمادیا تھا۔

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ مطبع احمدی میں تصحیح کے سوا بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کی حاشیہ نگاری کی خدمت بھی اسی زمانہ میں آپ نے انجام دی تھی۔

ظاہر ہے کہ نکاح سے پہلے جب تصحیح و تحشیہ کا کام آپ کرتے تھے، تو گو والد ماجد سے نکاح کے وقت آپ نے عرض کر دیا تھا کہ بیوی اور بال بچوں کا نام لیکر روپے کمانے پر مجھے مجبور نہ کیا جائیگا جس سے بظاہر اشارہ وہی کمائی کے پیمانے کی طرف شاید کیا گیا تھا۔ ورنہ معاشی زندگی کے لئے کسب و اکتساب کے دھندوں میں نکاح سے پہلے جو عملاً مشغول تھا۔ اسی کے متعلق یہ خیال یقیناً بے بنیاد ہو گا کہ مطلقاً کسب و اکتساب سے آپ گریز کرنا چاہتے تھے۔

گریز کیا معنی، واقعہ یہ ہے کہ جب تک دلی میں یہ مطبع احمدی قائم رہا، آپ اس میں کام کرتے رہے، پھر ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان کا عموماً اور دلی کا خصوصاً نظم درہم و برہم ہو گیا، اور اسی فتنہ کا شکار مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مطبع بھی ہوا، مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم و برہم ہو گیا تھا، مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا ہوا۔" ص ۳۹

اور جیسا کہ آئندہ بہ تفصیل معلوم ہو گا ہندوستان کی آزادی کی اس جد و جہد میں براہ راست سیدنا الامام الکبیر بھی عملاً شریک تھے اور حکومت مسلطہ نے مجرم قرار دے کر آپ کے نام بھی وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا تھا، دار و گیر، رست و خیز کے اس ہنگامہ میں اس میں شک نہیں کہ چند سال تک مطبع احمدی کی خدمت سے الگ ہونے کے بعد آپ کی زندگی اس طرح گذری کہ بقول مصنف امام

"اس زمانہ میں سوائے وطن (نانوتہ) اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی۔" ص ۳۹

حکومت کے نمائندے آپ کی فکر میں تھے، اس لئے مصنف امام ہی کے بیان کے مطابق وقفہ کی اس مدت میں

"کبھی وطن (نانوتہ) اور کبھی دیوبند رہتے تھے۔" ص ۳۹

اور آخر میں ہندوستان کو چھوڑ کر بادبانی جہاز پر سوار ہو کر حج کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے بہر حال ان باتوں کی تفصیل تو آگے آرہی ہے، یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مطبع احمدی کی بربادی کے بعد ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۸ھ میں سفر حج سے جب ہندوستان آپ واپس تشریف لائے۔ تو چار سال وقفہ کی یہ مدت ایسی ضرور گذری ہے جس میں کسی خاص معاشی مشغلہ میں مشغول ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، اور یوں کسب و اکتساب کے قصوں سے کچھ دن کے لئے مجبوراً آپ کو الگ ہونا پڑا، لیکن حکومت مسلطہ کی نگرانی جوں ہی آپ سے اٹھائی گئی، تو دلّی میں اگرچہ اپنی پہلی خدمت کی طرف واپسی کا موقعہ مطبع احمدی کے ختم ہو جانے کی وجہ سے باقی نہ رہا تھا لیکن جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"منشی ممتاز علی[1] صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا۔" ص ۳۹

[1] یہ منشی ممتاز علی جن سے بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی پرانی دوستی تھی، اپنے وقت کے مشہور خطاط اور خوشنویس تھے، خطاطی کی دنیا میں "نزہت رقم" کے لقب سے ملقب تھے، اور خوشنویسی کے اسی کمال کی وجہ سے مطبع کے قائم کرنے میں ان کو سہولت ہوئی، منشی ممتاز علی صاحب کے بعد ان کے دو صاحبزادوں منشی مشتاق علی و منشی عبد الغنی کو بھی خطاطی کے کمال میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، خصوصاً خط نسخ (عربی) میں منشی مشتاق علی کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی کتابت کے لئے سب سے پہلے ارباب مطابع کی نظر آپ ہی پر پڑتی تھی، اور یہ کمال منشی ممتاز علی صاحب مرحوم کا ان کے لڑکوں ہی تک محدود نہ رہا بلکہ آپ کے ان دونوں صاحبزادوں نے بکثرت اس فن کی عملی تعلیم لوگوں کو دی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جتنے کاتب پھیلے ہوئے ہیں ان کی بڑی تعداد کو بالواسطہ یا بلا واسطہ ان ہی دو صاحبوں سے شرف تلمذ حاصل ہے، یہاں اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ درس نظامیہ کے نصاب کی کتابوں کے خصوصاً اور اردو فارسی عربی زبانوں کی کتابوں کے عموماً دلّی کے مشہور ناشر مولوی عبد الاحد مرحوم کا مطبع مجتبائی دراصل منشی ممتاز علی صاحب ہی کا وہ مطبع ہے جو اسی نام سے میرٹھ میں قائم ہوا تھا، پھر منشی ممتاز علی صاحب قیام کی نیت سے ہندوستان چھوڑ کر جب عرب جانے لگے، تو مولوی عبد الاحد مرحوم نے ان سے ان کے اس مطبع مجتبائی کو خرید لیا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی علوم کی کتابوں کی اشاعت و طباعت میں غیر معمولی کام اس مطبع نے انجام دیا، منشی ممتاز علی صاحب کچھ دن قیام کرکے عرب سے پھر ہندوستان واپس آئے اور دلّی میں مطبع مصطفائی کے نام سے دوسرا جدید مطبع قائم کیا، جو کچھ دنوں چلتا رہا۔ محل وقوع اس کا کھڑکی تفضل حسین متصل زنانہ وکٹوریہ ہسپتال تھا جہاں اب بھی مطبع مصطفائی کا سائن بورڈ لگا ہوا ہے لیکن عملاً مطبع ختم ہو چکا ہے (باقی حاشیہ ص ۵۳۳ پر ملاحظہ ہو)

اور اسی چھاپہ خانہ میں وہی لکھتے ہیں

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کو بہ انی دوستی کے سبب بلالیا" ص ۳۹

اور بلا کر وہی کام جو مطبع احمدی دلی میں آپ کر رہے تھے میرٹھ میں بھی آپ کے سپرد کردیا گیا

مصنف امام نے میرٹھ کے اس مطبع سے آپ کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں

آپ کے ذمہ

"وہی تصحیح کی خدمت تھی" ص ۳۹

(بسلسلہ صفحہ ۵۳۲) ان معلومات کے لئے حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب مدظلہ العالی کے خلف رشید مولانا حفیظ الرحمٰن کا ممنون ہوں۔ دریافت کرنے پر ان تفصیلات سے انہوں نے آگاہ فرمایا' واقعہ یہ ہے کہ طباعت واشاعت کے لحاظ سے منشی ممتاز علی مرحوم کی شخصیت نے غدر کے بعد ہندوستان میں اسلام کی تقریباً اسی نوعیت کی خدمت انجام دی جو فرض تدریس کے لحاظ سے دار العلوم دیوبند نے ادا کیا۔

(متعلقہ ص ۵۳۲) ۵۷ منشی ممتاز علی صاحب کی مہارتِ فن کتابت ایک مسلم حقیقت ہے جیسا کہ مصنف سلمہٗ نے حاشیہ بالا میں ذکر فرمائی ہے۔ منشی صاحب ممدوح کا سلسلۂ تلمذ شاہی سلسلہ ہے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب زیدمجدہ صدر شعبۂ کتابت دار العلوم نے جو فی زمانہ اس سلسلہ فن کی ایک سنہری کڑی ہیں اور منشی ممتاز علی صاحب کے ہی سلسلۂ تلمذ میں بواسطہ منشی محبوب علی صاحب میرٹھی داخل ہیں مجھ سے بیان فرمایا کہ منشی ممتاز علی صاحب خط نسخ میں بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے تلمیذ رشید ہیں۔ سلسلۂ تلمذ میں داخل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ انہیں بہادر شاہ سے فن حاصل کرنے کا جذبہ و شوق دامنگیر تھا۔ مگر بادشاہ تک رسائی مشکل تھی۔ اسلئے خط نسخ میں کچھ قطعات وعبارات طبعزاد طریق پر لکھ کر جامع مسجد دہلی میں اس جگہ آویزاں کر دیتے تھے جہاں بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ تھی ایک دن بادشاہ سلامت کی نظر ان کے قطعات پر پڑی۔ قدرتاً صاحب فن کو فن کی چیزوں کی طرف کشش ہوتی ہے دیکھتے ہی ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ منشی ممتاز علی لگے ہی ہوئے تھے۔ بادشاہ کے یہ دریافت کرنے پر کہ یہ قطعات کس نے لکھے ہیں فوراً سامنے آکر آداب بجالائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کسی سے تلمذ حاصل ہے؟ عرض کیا کہ کسی سے نہیں عرصہ سے جہاں پناہ ہی کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہونے کا شوق ہے۔ فرمایا کہ اچھا آجایا کرو۔ قلعداروں کو مطلع کردیا گیا کہ اس نام کے شخص کو آنے سے نہ روکا جائے۔ چنانچہ منشی صاحب جاکر بادشاہ سے (جو اپنے دور میں اس فن کے یکتا مانے گئے ہیں) اصلاح لینے لگے اور وقت کے امام فن ہوئے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب ان ہی کے ایک واسطہ سے شاگرد ہیں اور آج اس فن کے ممتاز اور یگانہ مانے جاتے ہیں جو نہ صرف علماء ہی ماہر فن ہیں بلکہ علماء بھی اس فن پر پوری طرح قابو یافتہ ہیں۔ اہل فن کے یہاں مولانا اشتیاق احمد صاحب کے سلسلے منشی مشتاق علی صاحب قابل ذکر نہیں ہیں گو ان کا صاحب فن ہونا مسلم ہے۔

محمد طیب غفرلہٗ

قطعاً الگ تھلگ رکھا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف کی ذاتی شہادت جسے چشم دید گواہی سمجھنا چاہئے ان ہی کے بجنسہ الفاظ میں نقل کر دیتا ہوں، لکھتے ہیں

"یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامی دیوبند آپ ہی کا (یعنی سیدنا الامام الکبیر ہی) کا ساختہ پرداختہ اور کیا کچھ اس کا کارخانہ کہ چھوٹی سی سرکار، مگر ہرگز، کبھی، اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا۔"

آگے وہی رقمطراز ہیں

"اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسہ کی مدرسی قبول فرمائیے اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ، مگر قبول نہ فرمایا، اور کبھی کسی طور، یا ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے مدرسہ سے روادار نہ ہوئے حالانکہ رات دن، مدرسہ کی (خوش) اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول۔"

آخر میں وہی ان لوگوں کے سامنے جو سیدنا الامام الکبیر سے بھی واقف تھے اور مدرسہ سے بھی، سب ہی کے سامنے وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

"یہاں تک مدرسہ کے مال سے احتیاط تھی"

تمثیلاً حضرت والا کی اس عام عادت کی اطلاع دیتے ہیں کہ

"اگر کبھی بضرورت مدرسہ کے دوات وقلم سے کوئی اپنا خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانے میں داخل کر دیتے۔"

اور صرف داخل ہی نہیں کرتے بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی، جیسا کہ وہی لکھتے ہیں

"فرماتے کہ یہ بیت المال کی دوات ہے، ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں ہے۔"

اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک خاص قصہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

"آپ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کے مزاج میں حرارت بہت تھی، اور موسم گرما میں سرد مکان بہت مرغوب تھا۔"

اوران کے عقول کو نابالغ بنتے ہوئے دیکھا جاتا ہے، لیکن یہی اور بجنسہ اسی فطری رستہ کے استعمال کا ایک رنگ وہ بھی ہے جس کا جلوہ سیدنا الامام الکبیر کے اس طرز عمل میں نظر آرہا ہے، اور جو چھوٹوں کی چھوٹی عقلوں کو برائی کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ یہی کرتا ہے اور یہی اس کو کرنا بھی چاہئے۔ اسی طریقہ سے چھوٹے بالآخر بڑے بن جاتے ہیں، ورنہ گنگا جہاں الٹی بہنے لگتی ہے، یا بہانیوالے اسے الٹ کر بہانے لگتے ہیں یہاں اپنی بڑی عقل کو چھوٹوں کی چھوٹی خام عقلوں، اور ان کے خام نارسیدہ تقاضوں کے دھاروں پر بہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر اس کا تجربہ ہو کہ بچوں کی عقلوں میں خامی ہی کا اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، تو جو کچھ کیا جاتا ہے اسی کا نویہ لازمی ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے۔

اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بظاہر اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ اور پیار والے عام طریقہ کو جیسا کہ مصنف امام نے بھی لکھا ہے، سیدنا الامام الکبیر نے اختیار نہیں فرمایا تھا۔ لیکن قلبی اور باطنی طریقہ پر قلب اس درجہ اولاد پر شفقت سے بھرپور رہتا تھا کہ زندگی ہی کی حد تک نہیں بعد وفات بھی اولاد پر آپ کی وہی نگاہ شفقت قائم رہی، چنانچہ ان ہی صاحبزادے صاحب کے متعلق جن کی بھڑ کدار گٹھری کھولی گئی، اور نکال نکال کر کپڑے اسی گٹھری سے باہر صحن میں پھینکے جارہے تھے۔ ان ہی کے متعلق براہ راست خاکسار نے مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے جو بات سنی ہے جب کبھی اس کا خیال آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اور ظاہر حال سے باطن پر غلط استدلال کر کے

انزلوا الناس علی منازلھم	لوگوں کو اُن ہی کے درجہ پر رکھو۔

کی وصیت نبویہ کی تعمیل کی سعادت سے جو محروم رہ جاتے ہیں، ان پر افسوس ہوتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم سے اس واقعہ کا ذکر خاکسار نے حیدرآباد دکن میں اس وقت سنا تھا جب مولانا حافظ محمد احمد صاحب حکومت آصفیہ کی شاہی عدالت عالیہ کے مفتی بن کر تشریف لائے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن فرماتے تھے کہ حیدرآباد دکن میں مشہور حادثہ رود موسیٰ کے طوفان اور اس

واقعات اور متواتر روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت والا نہ کسی ملک کے والی تھے، اور نہ کسی حکومت کے وزیر وامیر، نہ کسی شہر کے تاجر، اور نہ کارخانہ دار، الغرض جود وکرم کے "جبلی ملکہ" کے ظہور کے لئے جن امکانات کی ضرورت ہے، ان سے آپ کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ یہ سچ ہے (تقریباً ایک صدی سے جو یہ دیکھا جارہا ہے، کہ خود دارالعلوم دیوبند کے مطبخ ہی سے نہیں، بلکہ دیوبند کے زیر اثر، یا اس کے نقش قدم کے مطابق ہندوستان کے طول وعرض کے بے شمار دینی مدارس کے باورچی خانوں سے کھانیوالوں کو جو کچھ کھلایا جارہا ہے۔ اور اللہ ورسول کے مہمانوں، دین کے طلبہ کی ضرورتیں جو پوری ہورہی ہیں بذل ونوال کے اس تماشے میں اسی کی ہمت اور اسی کے عزم اور ارادے کی قوت سب سے زیادہ نمایاں ہے، جس کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن سب کچھ رکھنے والوں سے بھی جو کام بن نہ آیا، وہی کام اس کچھ نہ رکھنے والے سے قدرت کے غیبی ہاتھ نے لے لیا، گویا شکر خورے تک براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی، شکر پہنچادی گئی، بلاشبہ یہ ایک واقعہ ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس عام قصے سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ ذاتی طور پر باوجود کچھ نہ رکھنے کے سیدنا الامام الکبیر جو کچھ کر گذرتے تھے، دیکھنے کا موقعہ تو مجھے نہیں ملا ہے لیکن دیکھنے والوں سے سن کر کم از کم میں تو مبہوت ہوجاتا ہوں، خصوصاً اس سلسلہ میں آپ کا یہ "فطری رجحان" اس وقت غیر معمولی طور پر نمایاں ہوجاتا تھا، اس سلسلہ میں دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ ہمارے مصنف امام جیسے محتاط بزرگ کے قلم سے شہادت کے یہ الفاظ بے ساختہ نکل پڑے ہیں، ارقام فرمایا ہے کہ

"مہمان نوازی مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) پر ختم ہے[۱]"۔ ص ۳۳

(بقیہ ص ۵۶۵) نے صدر صاحب حالانکہ ذاتی طور پر حکومت آصفیہ کی وزارت کے منصب پر فائز تھے۔ لیکن ذاتی ادعا کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزار روپے کی منظوری کیلئے ممکنہ ذرائع سے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا لیکن ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آیا کہ حدیث کی ایک کتاب کیلئے ہزار روپے کی منظوری کیسے دی جاسکتی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری حصہ کتاب کا شائع نہ ہوسکا۱۲

[۱] اس موقعہ پر مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کی اس رویا کا ذکر بھی فرمایا ہے جو بچپن میں آپ کو ہوئی تھی دیکھو ص ۵۶۷

یہ ایک صوفی صافی، ثقہ و حجت محدث کی گواہی ہے جس نے بچپن سے آخر عمر تک آپ کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا، گرم و سرد سفر حضر میں جن کی زندگی آپ کے ساتھ گذری تھی سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی جو کچھ دیکھا تھا اسی کی روداد کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"مہمان آپ کے یہاں دور و نزدیک سے امیر و غریب سب ہی قسم کے اکثر ہوتے رہتے تھے۔ جوق جوق لوگ ہر طرف سے آتے تھے۔ یہ شعر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا آپ کی شان کے مناسب تھا ؎

فطوبی لباب کبیت العتیق حوالیہ من کل فج عمیق"

آگے اپنے مشاہدہ کو ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہوئے کہ

"مگر اس کثرت پر کبھی تنگ دل نہ ہوتے اور کمال کشادہ پیشانی سے ان کی (مہمانوں کی) مدارات فرماتے"

ان ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"جس دن مہمان زیادہ ہوتے اس دن بہت خوشی ہوتی، اور جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا اس دن انتظار فرماتے"

اسی کے قریب قریب مولانا طیب صاحب کا بھی بیان ہے کہ

"مولانا مرحوم کے یہاں مہمانوں کی آمد و رفت بہت رہتی تھی، کوئی تاریخ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا، جس میں کوئی مہمان نہ ہو، اور بعض اوقات بڑا مجمع ہو جاتا تھا"

آگے وہ بھی لکھتے ہیں کہ

"جس دن زیادہ مہمان ہوں، مولٰنا زیادہ تر خوش ہوتے اور جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا مولانا

(بقیہ ۵۶۶) یعنی خواب میں دکھایا گیا کہ آپ کی وفات ہو گئی دفن ہونے کے بعد جبرئیل علیہ السلام معلوم ہوا کہ سامنے آئے اور کچھ نگینے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے اعمال ہیں، ان ہی نگینوں میں ایک نگینہ غیر معمولی بڑا اور خوشنما تھا اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جبرئیل امین نے کہا کہ یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل کا ہے" اس خواب کا تذکرہ کسی موقعہ پر آ چکا ہے۔ میں نے بیان کیا تھا کہ مہمان نوازی میں آپ کی غیر معمولی اولوالعزمیوں کو بعضوں نے اس خواب کی تعبیر قرار دیا ہے"

یہ قصہ وہاں بھی جاری رہتا تھا، نانوتہ کی مسجد کی سہ دری میں جہاں حضرت والا کا قیام رہتا تھا، جب گنجائش مہمانوں کے ٹھہرنے کی باقی نہ رہتی تو اپنے ماموں صاحب کے مکان میں مہمانوں کو اتارتے، اسی موقعہ پر خود اپنے ساتھ اس گذرے ہوئے واقعہ کا تذکرہ مولانا منصور علی صاحب نے جو کیا ہے کہ ایک دفعہ چند مہمانوں کے ساتھ ایک بڈھا مسکین شکستہ حال بھی تھا، کھانے کے وقت دوسرے مہمانوں کے ہاتھ تو دھلا دیئے گئے، مگر بڈھے کی طرف کسی نے التفات نہ کیا، مولوی منصور علی خاں صاحب نے بیان کیا ہے کہ اچانک میں نے دیکھا سیدنا الامام الکبیر بے تحاشا جھپٹ کر اس بڈھے کے پاس آئے اور لوٹے کو خود اپنے ہاتھ میں اٹھا کر اس غریب کے ہاتھ بڑے ادب کے ساتھ دھلوا رہے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت والا کے یہ بوڑھے مہمان جن کا تعارف مولانا منصور علی خاں صاحب مرحوم نے

"بڈھا، مسکین، شکستہ حال"

کے الفاظ سے فرمایا ہے، جو کچھ بھی ہوں، لیکن تھے تو بہر حال وہ مسلمان، اور حضرت کے عقیدتمندوں ہی میں ہوں گے۔ لیکن مہمانوں کے متعلق جس کی نظر کی وسعت کا یہ حال ہو، کہ دہلی ٹھسکہ والے درویش جن سے مشربًا گونہ حضرت والا کا اختلاف بھی تھا۔ ان ہی کو ذریعہ بنا کر جیسا عرض کر چکا ہوں حضرت گنگوہی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان دراندازوں نے دراندازی بھی کرنی چاہی تھی، ان ہی کا قصہ بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب گھوڑے پر آئے تھے، ساتھ اُن کے سائیس بھنگی ذات کے تھے، یہی سننے کی بات ہے کہ التزامًا ہمیشہ اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانے کا جو عادی تھا، اسی کو دیکھا گیا ہے کہ شاہ صاحب کے دستر خوان پر خاطر مدارات کے لئے تو دوسروں کو بٹھا دیا گیا ہے، اور بقول حضرت تھانوی سیدنا الامام الکبیر نے

"ان کے (شاہ صاحب) کے سائیسوں کو خود کھلوایا"۔ الہادی جمادی الثانی ۵۷ھ

جب بھنگیوں کے محلہ میں مہاتما گاندھی نے اپنا مقامی "آشرم" کچھ دن کے لئے دہلی میں بنوایا تو

صرف ہندوستان ہی نہیں، ساری دنیا میں اس کا چرچا ہوا، لیکن دیکھ رہے ہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک تربیت یافتہ غلام کو اس واقعہ سے سالہا سال پہلے اسی ہندوستان میں بھنگیوں کو مہمان بناکر ان کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں یہ نمونہ پیش ہو رہا ہے کہ بھنگیوں کے آقا شاہ صاحب کو دوسروں کے حوالہ کر کے بنفس نفیس خود بھنگیوں کو کھانا کھلوایا جا رہا ہے[لے]۔ اور بھنگی بے چارے تو پھر بھی آدمی ہی تھے۔ مہمان کی طرف منسوب ہو جانے کے بعد اکرام و احترام کا استحقاق جانوروں کو بھی جس کے یہاں حاصل ہو جاتا تھا، اور کیسا استحقاق! ہمارے مصنف امام راوی ہیں۔

"ایک بار مہمانوں کی کسی سواری کے لئے دانے کی ضرورت تھی چنے نہ ملے"۔

چنے نہ ملے تھے تو جو وغیرہ جیسے اناج سے بھی کام چل سکتا تھا، اور اناج ہی کی سرے سے کیا ضرورت تھی۔ جانوروں کے لئے تو گھانس بھونسہ کی خوراک بھی کافی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس وقت سوال جانور کی خوراک کا نہ تھا، بلکہ مہمان کی سواری کے جانوروں کا مسئلہ تھا۔ سنئے مصنف امام فرماتے ہیں کہ چنے جب نہ ملے تو،

"گھر ہیں کابلی چنے رکھے ہوئے تھے"۔

ہندوستان میں عموماً کم مقدار میں پیدا ہوتے ہیں، اور اناج کی اعلیٰ قسموں میں کابلی چنوں کا شمار ہے۔ لیکن مہمان کی سواری کے جانور کی مہمانی کے لئے سیدنا الامام الکبیر نے حکم دیا کہ کابلی چنے ہی دیئے جائیں، مصنف امام کا بیان ہے۔

[لے] اس موقعہ پر بے ساختہ دلی ہی میں گذرے ہوئے واقعہ کا خیال آگیا۔ حضرت مولانا فخر دہلوی کے حالات میں لکھا ہے کہ بیرا نامی خاکروب دلی میں تھا۔ خانقاہ مبارک کی صفائی کا کام اس سے متعلق تھا۔ ایک دفعہ مسلسل دو دن تک بیرا پر مولانا کی نظر پڑی ضیافت فرمایا گیا معلوم ہوا کہ بیمار ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ "ہماں ساعت از جا برخاستند" جانتے ہو اٹھ کر کہاں گئے۔ دیکھا گیا کہ بھنگیوں کے محلہ کی طرف جا رہے ہیں اور بیرا غریب کا جہاں جھونپڑا تھا وہاں پوچھتے ہوئے پہنچے غریب پڑا ہوا تھا، مولانا اس کی بالیں پر کھڑے تھے اور فرما رہے تھے "میاں بیرا اندوہ رو نیامدید واز فقیر پرسش احوال شما باغیر خدا معاف خواہید فرمود" بجنسہ آپ کے سوانح نگار نے بھی یہی فقرہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ علاوہ نقد کے مولانا نے حکم دیا کہ میرے طبیب خاص میر حسن حکیم سے بیرا کا علاج کرایا جائے اور دوا وغیرہ کے مصارف میری طرف سے ادا کئے جائیں جو نہیں جانتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محمد شاہ بادشاہ تک مولنا فخر کی خانقاہ میں حاضری دیا کرتے تھے ۱۲ سیر الاولیاء ص ۱۱

"فرق کو دیکھو! کہ دنیا ہمارے قدموں پر گرتی ہے، اور دنیادار اس کے قدموں پر گرتے ہیں" (ارداح ثلثہ ص۲)

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی بھولنا نہ چاہئے کہ ؎

ساقی دیرینہ را ساغر شکست

بزم رندان حجازی بر شکست

کے حادثے کے بعد ڈاکٹر اقبال مرحوم ہی کے الفاظ میں یہ دیکھا جارہا تھا کہ

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش　　آہ ازیں سوداگرانِ دین فروش

با مریداں روز و شب اندر سفر　　از ضرورتہائے ملت بے خبر

اس دردناک منظر نے شاید سیدنا الامام الکبیر کو اس فیصلہ پر مجبور کیا تھا، مولانا طیب صاحب کا بیان ہے، کہ اسلامی ہند کا

"کوئی گاؤں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں کے باشندے آپ کی تشریف آوری کے آرزومند نہ ہوں، ہمیشہ آپ کے پاس درخواستیں دور دراز سے آتی رہتی تھیں کہ حضورؒ یہاں آئیں"

لیکن وہ اطلاع دیتے ہیں کہ باوجود اس کے

"بہت جگہ کے لوگوں کی تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں، اور مولٰنا مرحوم کا جانا نہ ہوا"

اسی سلسلہ میں آگے وہی آپ کے اس عمومی دستور کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ

"مولانا مرحوم کو بلا ضرورت پھرنا پسند بھی نہ تھا"

غالباً اسی رجحان اور فیصلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ یو، پی، اور یو، پی میں بھی خصوصیت کے ساتھ نو، میل گنگوہ کے خاص خاص مقامات جو وطن مالوف کے گرد و نواح میں ہیں ان کے سوا سیدنا الامام الکبیر کی سیر و سفر کا دائرہ بہت زیادہ مختصر اور تنگ ہے، الا یہ کہ حج کے سفر میں جن جن مقامات سے گذرنا پڑا علاوہ اس کے امیر شاہ خاں مرحوم کا یہ بیان بھی ہے کہ

"مولانا نانوتوی کا قاعدہ تھا کہ سفر میں ہدیہ نہ لیتے تھے":

کیوں نہ لیتے تھے، واللہ اعلم بالصواب اس کے صحیح اسباب کیا تھے، ایک بات ان ہی کی طرف منسوب کر کے خاں صاحب ہی روایت کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ سفر میں کسی صاحب نے کچھ پیش کیا، تو انکار کرتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ

"میرا معمول ہے ہیں سفر میں ہدیہ نہیں لیتا ہوں، اور مصلحت یہ ہے کہ کبھی آدمی کے پاس ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ہے، سفر میں اپنے دوستوں سے ملاقات ضرور ہوتی ہے اب اگر کسی نے پہلے سفر میں کچھ دیا تھا، اور اس سفر میں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، تو وہ یا ملنے سے کترائے گا، اور اگر ملے گا بھی تو جھینپ اور شرمندگی کے ساتھ ملے گا"۔ ص۱۷۵

قصہ مختصر یہ ہے، کہ فتوحات کی آمدنی کی توسیع کا بڑا ذریعہ سفر ہے، پہلے تو اسی کا دائرہ محدود کر دیا گیا تھا، اور خاص خاص اہم ضرورتوں کے لئے سفر اگر فرماتے بھی تھے، تو اس میں بھی اس آمدنی کی راہ آپ نے خود بند رکھی تھی، اب رہ گیا حضر، سو اس کے متعلق بھی اس کلی ضابطہ کو براہ راست حضرت والا ہی کی طرف منسوب کر کے امیر شاہ مرحوم بیان کیا کرتے تھے، کہ سیدنا امام الکبیر فرماتے تھے،

"جو شخص ہم کو محتاج سمجھ کر دیتا ہے، اس کا ہدیہ تو لینے کو جی نہیں چاہتا، اور جو اس غرض سے دیتا ہے کہ ہمارے (یعنی دینے والے) کے گھر برکت ہو، اور ہمارے لے لینے کو ہمارا احسان سمجھے اس کا ہدیہ لے لینے کو جی چاہتا ہے، اگرچہ وہ چار پیسے ہی ہوں"۔ ص۱۷۴

اور اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیا دے رہا ہے، اس پر نظر نہ رہتی تھی، بلکہ کون دے رہا ہے اور کس جذبہ کے تحت دے رہا ہے۔ صرف اسی کو دیکھا جاتا تھا۔ جونڈے باندھ کر برستے ہوئے پانی میں اللہ دیا نور باف کے گھر پہنچ کر ماش کی دال کی روٹی جو کھا سکتا ہو، وہ چار پیسوں کے دینے والے غریب مسلمانوں کے دلوں کو توڑنے کی ظاہر ہے کہ اپنے قلب میں قوت ہی کہاں پا سکتا تھا۔

مولانا محمد یعقوب صاحب کی نگرانی میں کھانا تیار ہوا،

"سب نے مل کر دو دو لقمے کھائے" ص۳۶ الہادی ماہ شعبان

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خیرات والے دو پیسے بجائے خیرات[۱] کرنے کے عبداللہ شاہ مرحوم نے

۱؎ اس جملہ میں کچھ تسامح ہوا ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ یہ واقعہ اس طرح سے سنا ہے کہ یہ عبداللہ شاہ صاحب (دیوبندی جو اولیاء کاملین میں سے تھے) گھاس کھود کر بیچتے اور اپنی معاش اسی طرح پیدا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ایک گٹھری گھاس کی معمولاً چھ پیسے میں فروخت کیا کرتے تھے۔ شہر والے جو گھاس خریدنے جاتے وہ شاہ جی کی گٹھری کے منتظر رہتے۔ جوں ہی شاہ جی گٹھری لئے ہوئے آتے دکھائی دیتے ووں ہی تمام خریدار ان کی طرف دوڑ پڑتے اور گٹھری خریدنے میں ہر ایک پہل کرنے کی کوشش کرتا۔ شاہ جی کا معمول یہ تھا کہ چھ پیسے قیمت لیکر دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا جس کا نمک تیل وغیرہ لے لیتے اور دو پیسے روز جمع کرتے تھے۔ سال بھر میں ان جمع شدہ پیسوں سے ہمارے ان اکابر حضرت نانوتوی حضرت گنگوہی مولانا محمد یعقوب صاحب وغیرہ حضرات کی دعوت کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا بیان ہے کہ ہم سال بھر تک اس دعوت کے منتظر رہا کرتے تھے اور جس دن یہ کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور محسوس ہوتا تھا اور راتوں عبادت و طاعت کرنے کو جی چاہتا تھا مصنف سلمہ نے متن میں جو واقعہ نقل فرمایا ہے وہ صرف ایک جزئیہ ہے کہ شاہ جی نے فرمایا کہ پکانے کا بندوبست آج میرے یہاں نہیں ہے آپ خود پکا کر کھالیں۔ اس جزئیہ میں اتنا اضافہ اپنے بزرگوں سے اور سنا ہے کہ اس پکانے اور کھلانے کا ذمہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے لیا اور اتنا اہتمام فرمایا کہ اس کھانا پکانے کے لئے غسل کیا جگہ پکانے کی صاف ستھری بنائی اور طہارت و نظافت کا غیر معمولی اہتمام کرکے کھانا پکایا اور ان بزرگوں نے ایک ایک دو دو لقمہ بڑی عقیدت سے تناول فرمائے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس میں وہ خیرات کے پیسے شامل نہیں تھے، جن کا ذکر قیاسی طور پر متن میں کیا گیا ہے۔

یہ عبداللہ شاہ اولیاء کاملین میں سے تھے۔ ان کے بارے میں جناب مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر شعبہ کتابت دارالعلوم دیوبند نے بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب) سے سنا جو ان بزرگوں کے یہاں ہر وقت کے حاضر باش تھے کہ جب مدرسہ دیوبند قائم ہوا تو دیوبند کے تحصیلدار نے گورنمنٹ میں رپورٹ کی کہ یہ مدرسہ جہاد کی تعلیم کے لئے (اور بالفاظ دیگر گورنمنٹ کے خلاف بغاوت پھیلانے کے لئے) قائم ہوا ہے۔ یہ خبریں سنکر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ نے عبداللہ شاہ صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ ایسی خبریں ہیں اس کا خیال رکھئے۔ شاہ جی اس فہمائش کے بعد کچھ عرصے غائب رہے اور کچھ عرصہ کے بعد آکر ان حضرات سے ملے اور بہت ہنستے ہوئے ملے۔ غیر معمولی ہنسی اور فرحت کے لہجہ میں فرمایا خوب پڑھاؤ خوب پڑھاؤ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طے کر لیا ہے یہ مدرسہ تو ہمیشہ رہیگا۔ ان خبروں کی کوئی پروا نہ کرو (باقی ص۵۸۴ پر)

پیش کر دیئے ہوں گے' اسی لئے دو دو لقموں سے زیادہ کی گنجائش پیدا نہ ہوئی[لہ]۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ نانوتہ کی زمینداری اور تصحیح کی آمدنی کے سوا' اخوان یعنی اہل عقیدت کی طرف سے جو کچھ پیش ہوتا تھا' مذکورہ بالا قیود اور خصوصیتوں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر رد نہیں فرماتے تھے' میرے پاس کوئی مفصل فہرست یا اس سلسلہ میں جو آمدنی ہوتی تھی اس کا باضابطہ ہی کھاتہ تو نہیں ہے' لیکن چار پیسے' بلکہ اگر عبداللہ شاہ والی روایت کے متعلق میرا خیال غلط نہیں ہے تو چند پیسے تک بھی گویا لے لئے جاتے تھے' کسی موقعہ پر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک غریب آدمی مجلس مبارک میں صرف شکر کی پڑیہ لیکر حاضر ہوا' اور اسے بھی قبول کر کے حسب دستور حاضرین میں تقسیم فرمانے کا حکم دیا گیا' اسی موقعہ پر بیعت کا لطیفہ بھی پیش آیا تھا' یاد ہوگا کہ شکر لانے والے کی

(بقیہ حاشیہ) اور مطمئن ہو کر پڑھاؤ۔ یہ بزرگ درحقیقت صاحب خدمت تھے اس لئے اس قسم کے انتظامی معاملات میں یہ اکابر بھی ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اکابر اولیاء کے پیسے کا جو براہ راست دربار رسالت میں حاضر باشی اور معاملات رجوع کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوں' اس درجہ پاک اور حلال و طیب ہونا کچھ زیادہ عجیب نہیں کہ دوسرے اولیاء اس کے سال بھر تک آرزو مند رہتے ہوں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اکابر جو مخلصین کی دعوت بشوق و رغبت قبول کرتے تھے' اس کا راز یہی ہوتا تھا کہ ان مخلصین کے پیسہ میں اکل حلال ہونے کی نورانیت رچی ہوئی ہوتی تھی۔ ان اکابر کی یہ آرزو بعینہ اس سنت صحابہ کے عین مطابق ہے کہ ایک بوڑھی صحابیہ چقندر وغیرہ پکایا کرتی تھیں اور ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ حضرات صحابہ کو بلا کر کھلایا کرتی تھیں۔ ہفتہ بھر تک ان حضرات صحابہ کو اس کھانے کا انتظار رہتا تھا اور جمعہ پڑھتے ہی یہ سب مقدسین ان ضعیفہ کے یہاں پہنچ جاتے اور انتہائی آرزو اور شوق کے ساتھ ان کے یہاں کا کھانا تناول فرماتے۔ بعینہ اسی طرح یہ اکابر و اسلاف دیوبند بھی چونکہ خلوت و جلوت میں نمونۂ صحابہ تھے' بلکہ ان کی فطرتیں اور طبیعتیں ہی ان سلف صالحین کی رفتار کی تبع ہو چکی تھیں۔ اس اکل حلال کے سال بھر شائق اور منتظر رہا کرتے تھے۔ فرحمہم اللہ و رضی عنہم و رضوا عنہ

محمد طیب غفرلہ

لہ انا عند المنکسرۃ قلوبہم (یعنی میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس رہتا ہوں) بطور حدیث قدسی کے صوفیہ میں یہ روایت جو مشہور ہے اس کا تجربہ اس موقعہ پر بھی ہوا' حضرت تھانوی سے مولانا محمد یعقوب صاحب بیان کرتے تھے کہ عبداللہ شاہ کے پیسوں سے پکے ہوئے چاول جیسے ہی حلق سے اترے ایک روحانی لذت اور نور محسوس ہوا' اور لطف یہ کہ اس کا اثر مدت تک رہا" الہادی ماہ شعبان ۵۰ھ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسی قدسی حدیث کے حاصل کو اپنے مشہور شعر میں نظم کر دیا ہے ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے' ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں ۱۲

مصنف امام نے اپنی چشم دید شہادت یہ قلم بند کی ہے کہ

"وہ دوائیں مولانا کے لئے میسر ہوئیں کہ جو امرا کو بھی شاید بدشواری میسر آویں"

آخر میں ان کے محتاط قلم سے یہ الفاظ تک ادا ہوئے ہیں کہ

"اور ایسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو" ص۲۳

اور امیر شاہ خاں صاحب مرحوم کی یہ روایت جو ارواح ثلثہ میں پائی جاتی ہے کہ

"مولانا نانوتوی جب مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو آپ نے مولوی محمود الحسن صاحب سے فرمایا کہ کہیں سے گگڑی لاؤ"

اب واللہ اعلم واقعہ کی صورت کیا تھی دیوبند وغیرہ میں گگڑیاں کم ہوتی ہیں، یا اس علاقے میں ان کے پھلنے کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا، خان صاحب کا بیان ہے کہ

"مولوی محمود الحسن فرماتے تھے کہ میں تمام کھیتوں میں پھرا، مگر صرف ایک گگڑی چھوٹی سی ملی"

ظاہر ہے کہ ایک اور وہ بھی چھوٹی سی گگڑی کا ملنا نہ ملنے کے برابر تھا، بیماری میں قاعدہ ہے کہ مریض کی لُو کسی چیز کی طرف جب لگ جاتی ہے تو جب تک خواہش پوری نہ ہو لو لگی ہی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ یہی کیفیت سیدنا الامام الکبیر کی گگڑیوں کے متعلق ہو گئی تھی۔ اب یہی سننے کی بات ہے مانگ دل میں جس کے پیدا ہوتی ہے وہ دیوبند میں ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ دیوبند سے یہی خبر کہ مولانا نانوتوی میں گگڑیوں کی لُو پیدا ہو گئی ہے، اور وہاں نہیں مل رہی ہے، یہی خبر لکھنؤ پہنچتی ہے، اور بقول خاں صاحب کسی طرح اس کی خبر

"مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی کو ہو گئی"

پھر جانتے ہیں کیا ہوا؟ خاں صاحب راوی ہیں

"مولوی عبدالحی صاحب نے لکھنؤ سے مولانا (سیدنا الامام الکبیر) کی خدمت میں بذریعہ ریلوے گگڑیاں بھیجیں، اور چند مرتبہ بھیجیں" ص۱۷۳

ساتھ زندگی کے آخری لمحات تک اس طریقہ سے نباہتے چلے جانا، کہ ایک طرف خلق کے متعلق سوانح مخطوطہ کے مصنف اگر اپنی چشم دید شہادت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ۔

"یتیموں اور شکستہ حالوں کی خبر گیری فرماتے، متوکل لوگوں کی خفیہ خدمت کرتے۔"

تو خالق کے ساتھ آپ کے تعلق بیدار کا حال یہ تھا، مولانا منصور علی خاں فرماتے ہیں کہ

"نماز باجماعت ادا کرتے، اور تکبیر اولیٰ کو کبھی ترک نہ کرتے، اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کر دیتے[له]" ص۱۹۲

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بالکل سچ لکھا ہے کہ

"مولانا مرحوم کی چال سہل ممتنع تھی۔"

اور جو کچھ انہوں نے دیکھا اور پایا تھا، اسی کو ظاہر کرتے ہوئے بے ساختہ ان کے قلم پر یہ الفاظ آ گئے ہیں

"آپ کے (سیدنا الامام الکبیر کے) اکثر حالات مناسبت رکھتے تھے حالات فیض آیات، حضرت سید الکونین، رسول الثقلین، ختم المرسلین، محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے۔" ص۱

غلام کی زندگی میں آقا کے خط و خال کی یہی جھلک ہے، جس کی طرف مسلسل اشارے کرتا ہوا چلا آیا ہوں، اور اب آپ کے ذاتی حالات، اخلاق و عادات کی اس بحث کو اسی

[له] میں نے اپنی دادی صاحبہ مرحومہ سے سنا فرماتی تھیں کہ عادت حضرت کی یہ تھی کہ اذان میں مؤذن کا کلمہ حی علی الصلاۃ جوں ہی کان میں پڑتا، لیٹے ہوتے تو فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور کسی کام میں ہوتے تو اسی دم اس کام کو چھوڑ کر نماز کی تیاری میں مشغول ہو جاتے بعینہٖ یہی حال احقر نے دادی صاحبہ مرحومہ کا دیکھا۔ الصلوٰۃ لوقتہا کی پابندی ان کی مثالی تھی۔ اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام کو جس میں مشغول ہوتیں اس طرح ایک دم چھوڑ کر نماز میں لگتیں کہ گویا انہیں اس مشغلہ سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں، اور اذان کے بعد ہر ایک سے اجنبی بن جاتیں

محمد طیب غفرلہ

تھے، اور علاج بھی کرتے تھے، تو وہ طبیبوں اور ڈاکٹروں والا علاج نہ ہوتا تھا،
بلکہ صحت میں جس کی زندگی اُن کے لئے واحد نمونہ بنی ہوئی تھی، مرض میں بھی

(بسلسلہ صفحہ ۶۰۹) روشنی پڑ سکتی ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ حضرت والد مرحوم بیمار ہوتے تو معمولی بیماری میں بھی کول کراہ سے بے تابی اور بے چینی کا اظہار زیادہ کرتے۔ جیسے کوئی عظیم مرض لاحق ہوگیا ہے۔ ایک بار ملیریا میں مبتلا ہوئے اور حسب عادت کول کراہ اور ہائے وائے بہت کر رہے تھے تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت یہ اتنا آہ و بکا تو بظاہر صبر و توکل اور تسلیم و رضا کے خلاف معلوم ہوتا ہے، تو قدرے مسکرا کر فرمایا کہ بھائی میں نے اپنے تین بزرگوں کو دیکھا ہے اور دیکھا ہی نہیں برتا بھی ہے۔ حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب (جو اُن کے شیخ تھے) حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (جو اُن کے اُستاد حدیث تھے) بیماری میں تینوں کے تین حال تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو معمولی سی بیماری میں ہائے وائے اتنا کرتے کہ مکان کو سر پر اٹھا لیتے۔ عرض کیا گیا کہ حضرت کیا یہ تسلیم و رضا کے خلاف نہیں؟ فرمایا کہ تو کیا میں اپنے اللہ کے سامنے بہادر بنوں کہ آپ کے ابتلاء و امتحان کے تحمل کی مجھ میں بڑی طاقت ہے۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے ابتلاء کے سامنے بندہ اپنے عجز و بے چارگی اور ناتوانی کو پیش کرے کہ خداوندا میں تیری آزمائش کو اٹھانے کے قابل نہیں، بہت ہی ضعیف و ناتواں ہوں، تو بلا آزمائش ہی مجھ پر فضل فرمادے۔ پھر والد مرحوم نے فرمایا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان یہ تھی کہ بڑی سے بڑی بیماری سر پر آجاتی تو کبھی زبان سے اُف نہ فرماتے اور اس قدر خوشی اور سکون سے گذارتے کہ بہت سی بیماریوں کا تو پتہ بھی نہ چلتا۔ علاج و معالجہ تو بعد کی بات ہے۔ دفع مرض کے بعد کبھی خود ہی زبان سے نکل جاتا تو گھر اور باہر والوں کو پتہ چلتا کہ بڑی شدید بیماری آئی تھی، اور فرماتے کہ اللہ کی طرف سے جو حالت بھی آئے اُسے صبر و تسلیم کے ساتھ گذار دے کہ ع ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔ فرمایا کہ عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ دوسروں کے سامنے چون و چرا نہ کرے اور معاملہ شافی مطلق پر چھوڑ دے (باقی صفحہ ۶۱۱ پر)

مکتبہ رحمانیہ

MAKTABA-E-REHMANIA